عدالتی استثناء سے متعلق پاکستانی قوانین کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل (علومِ اسلامیہ)

مقالہ نگار

محمد شہران

ایم فل سکالر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

دسمبر 2022

عدالتی استثناء سے متعلق پاکستانی قوانین کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے **ایم فل علوم اسلامیہ**

مقالہ نگار

محمد شہران

بی ایس، کلیۃ الشریعۃ (الجامعۃ الاسلامیۃ بالمدینہ المنورہ سعودی عرب) 2017ء

یہ مقالہ ایم فل علومہ اسلامیہ کی جزوی تکمیل کے لئے پیش کیا گیا ہے

ایم فل، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سیشن 2020.2022

©(محمد شہران)

بسم الله الرحمن الرحيم

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval Form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائینسز سے اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **عدالتی استثناء سے متعلق پاکستانی قوانین کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ**

A Review of Pakistani Laws on judicial Immunity in the light of Islamic teaching Adalti Istisna Sai Mutalliq Pakistani Qawanin Ka Islami Talimaat Ki Roshni Mai Jaeza

نام ڈگری: ایم فل۔ماسٹر آف فلاسفی علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: محمد شہران

رجسٹریشن نمبر: 3-Mphil/IS/S20

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی
(نگران مقالہ) _____ دستخط نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی
(صدر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت) _____ دستخط صدر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

پروفیسر ڈاکٹر خالد سلطان
(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) _____ دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

پروفیسر ڈاکٹر عامر اعجاز
(پرو ریکٹر اکیڈمکس) _____ دستخط پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ _____

حلف نامہ فارم

(Candidate Declaration Form)

میں **محمد شہران** ولد **لیاقت علی**

رول نمبر:MP-IS-S20-556 رجسٹریشن نمبر:3-Mphil/IS/S20

طالب، ایم فل، شعبہ اسلامی فکر وثقافت، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ

بعنوان: **عدالتی استثناء سے متعلق پاکستانی قوانین کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ**

A Review of Pakistani Laws on judicial Immunity in the light of Islamic teaching
Adalti Istisna Sai Mutalliq Pakistani Qawanin Ka Islami Talimaat Ki Roshni Mai Jaeza

ایم فل علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے، اور **پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی** کی زیر نگرانی تحریر کیا گیا ہے، راقم الحروف کا اصل کام ہے، اور یہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کرایا گیا ہے، نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ ایچ ای سی اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد علمی سرقہ کے حوالے سے عدم برداشت کی پالیسی پر سختی سے عمل پیرا ہیں۔ اس لیے میں بطور مقالہ نگار اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ یہ میرا ذاتی علمی کام ہے۔ اس مقالہ کا کوئی حصہ بھی سرقہ شدہ نہیں ہے۔ اور میں نے جہاں سے بھی کسی علمی کام کو لیا ہے اس کا باقاعدہ حوالہ دیا ہے۔ میں اس بات کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ اگر میرے مقالے میں کسی بھی قسم کا باقاعدہ علمی سرقہ پایا جائے تو یونیورسٹی میری ڈگری کو ختم کرنے / واپس لینے کا اختیار رکھتی ہے۔

نام مقالہ نگار: **محمد شہران**

دستخط مقالہ نگار: _____

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Abstract

The issue of judicial immunity is legally one of the most debated issues in the world. In general, however, the debate revolves around citizenship and the interests of the nation-state. Religious exceptions are rarely discussed. Since Pakistan is an Islamic country and its constitution states that no law will be enacted against the law within the country, there was a great need to speak in detail on this issue keeping in view the religious point of view? Go especially when the laws of judicial immunity within Pakistan are of colonial pride, then it becomes necessary to discuss the subject in detail.

It has been generally observed that judicial immunity is mostly discussed with reference to the rulers, what is the status of the immunity granted to presidents and governors. While the other important aspect of this is also related to the judiciary that the concessions and privileges given to the judges should be related to the judiciary or of an administrative nature, the opinion of Shariah is also important in them. Therefore, there was a need to examine these two aspects in the light of Islamic teachings.

The main topics discussed in this article are not of a theoretical nature. On the contrary, in practical terms, the subject has been examined in detail in the light of the laws of Pakistan and there are also references to several cases in order to shed light on the developments on the subject and its implications.

The findings of the article are not such that the notion of judicial immunity should be rejected outright. On the contrary, Islam's point of view is based on equality and the results have come out in this context. However, Islam's unequivocal view of the judicial immunity of the rulers is that it is based on inequality and cannot be upheld. However, the concept of judicial immunity for judges and judiciary is not at all unlawful.

Pakistan's judicial immunity laws need to be reviewed as there are some issues which are against Islamic teachings and even more inequality in comparison with many western nation states. The article under review covers all aspects from the historical review of judicial immunity to Pakistani law and Shariah perspective.

KeyWords: Judicial Exception, Islamic Teachings, Judicial Exception Laws in Pakistan, Comparative Review, Political and Social Implications.

فہرستِ موضوعات

نمبر شمار	موضوعات	صفحہ نمبر
1	مقالہ کی منظوری کا فارم(Thesis Acceptance Form)	I
2	حلف نامہ فارم(Candidate Declaration Form)	II
3	ملخص مقالہ(Abstract)	III
4	فہرست عنوانات(Table of Contents)	IV
5	اظہارِ تشکّر (Expression of Thanks)	VI
6	انتساب(Dedication Form)	VII
7	مقدمہ(Introduction)	1
8	**باب اوّل: عدل اور عدالتی استثناء: تعارف وارتقاء**	11
9	فصلِ اوّل: عدالتی استثناء اور اس کے اطلاقات	12
10	فصلِ دوم: عدالتی استثناء کے قوانین کا ارتقاء	38
11	**باب دوم: پاکستان میں مروج عدالتی استثناء کے قوانین اور اشکالات**	52
12	فصلِ اوّل: پاکستان میں عدالتی استثناء کے قوانین کی نوعیت	53
13	فصلِ دوم: عدالتی استثناء کی قانونی حیثیت اور اشکالات کا جائزہ	65
14	**باب سوم: مروج عدالتی استثناء کے قوانین کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ**	77
15	فصلِ اوّل: مروج عدالتی استثناء اور اسلام کا منہج احتساب	78
16	فصلِ دوم: مروج عدالتی استثناء کے سماجی وسیاسی مضمرات: اسلامی نقطہ نظر	98
17	فصلِ سوم: عدالتی تحفظ سے متعلق اسلامی تعلیمات اور مروج قوانین کا تقابل	95
18	خلاصہ	109
19	نتائجِ مقالہ	111

20	سفارشات	112
21	فہرستِ آیات	113
22	فہرستِ احادیث	114
23	فہرست مصادر و مراجع	115

اظہارِ تشکر(Expression of Thanks)

رب ذوالجلال کا لاکھ لاکھ شکر کہ جس کے لیے تمام جہانوں کی تعریفیں ہیں۔ جس نے انسان کو قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ جس نے اپنے اس بندہ ناچیز کو علم کے لیے چنا اور اس تحقیق کو بھرپور طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق بخشی۔ درودوسلام نبی مکرم خاتم الرّسل جناب محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کی آل اور صحابہ کرم رضوان اللہ علیہم اجمعین پر، اس کے بعد اپنے والدین کا انتہائی احسان مند ہوں جن کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ کڑی دھوپ میں سایہ کی مانند رہی۔ ہمیشہ درست رہنمائی کی۔ اور اپنے بھائیوں کا ممنوں ومشکور ہیں جنہوں نے بھرپور حوصلہ افزائی کی اور مالی طور پر کبھی کمزور نہیں ہونے دیا۔ بالخصوص اپنے مربی ومحسن استاد محترم جناب ڈاکٹر مستفیض احمد علوی صاحب کا جنہوں نے اس کام کو اچھے طریقے سے مکمل کرنے کے لیے بہترین انداز میں رہنمائی کی۔ اور کوارڈینیٹر جناب ڈاکٹر مظفر صاحب، اور ان کے ساتھ ساتھ اپنے تمام قابل قدر اساتذہ اور شعبہ کے تمام عملے کا شکر گزار ہوں جن کی بدولت اس راستے کی مشکلات کم ہوئیں۔ یہ ان ہی کی رہنمائی تھی جس کی بدولت اپنے اندر چھپے محقق کو تلاش کر سکا۔ خصوصاڈاکٹر عبدالغفار شاہ بخاری اورڈاکٹر کفایت اللہ ہمدانی صاحب (پروفیسر عربیک ڈیپاٹمنٹ نمل) کا جن کی صحبت کی بدولت مجھے اس کام کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے بروقت رہنمائی کی۔ اس کے علاوہ تمام لائبریریوں کے عملے اور نمل کے منتظمین کا جنھون نے ہر طرح کی سہولیات مہیا کیں۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ تمام کو دنیاوآخرت جزاء دے اور کامیابی سے نوازے۔ آمین۔

انتساب(Dedication)

اس تحقیق کو اپنے والدین اور بھائیوں کے نام منسوب کرتا ہوں جنھوں نے زندگی میں ہمیشہ درست راستے کی طرف راہنمائی کی اور دعاوں کے ساتھ ساتھ مالی طور پر بھی کبھی کمزور نہیں ہونے دیا۔

مقدمہ

موضوعِ تحقیق کا تعارف/Introduction of the Topic

کسی بھی ملک میں امن وامان قائم رکھنے اور عامۃ الناس کو انصاف فراہم کرنا ایک ایسی تسلیم شدہ حقیقت ہے جس کی اساس پر معاشرے کی خوشحالی و ترقی ممکن ہوتی ہے۔ اسلام کی نظر میں عدل وانصاف کی فراہمی ایک ایسا عمل ہے جس میں مساوات و برابری کی قدر پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا گیا۔ اسلام نے عدل کے غیر جانبدارانہ نفاذ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور غیر جانبدارانہ عدل کو دینی انتظامی ڈھانچے کا ایک لازمی جزو قرار دیا ہے۔ مذہب کا نظریہ عدل ایسے اصولوں پر قائم ہے جو عہدے، منصب، رنگ و نسل اور غریب وامیر جیسے فرق اور قیود سے آزاد ہیں۔ اس کے ہاں تمام شہری برابر ہیں اور کسی فرد یا طبقے کو کسی دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلامی اور فقہ میں قضاء کے باب میں ایسی مثالیں کثرت سے موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح عدلیہ کے سامنے حاکم و محکوم کے مابین کسی قسم کی تفریق کو روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ خلفاء راشدین اپنے ہی مقرر کردہ قاضیوں کے سامنے ایک عام شہری کی طرح پیش ہوتے رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا مشہور فرمان ہے کہ اگر میری بیٹی فاطمہ پر بھی سرقہ کا الزام ثابت ہوتا تو میں اس کے ہاتھ کاٹ دیتا۔ صدرِ اسلام کے مرحلے کے بعد کی مسلم تاریخ میں عدل وانصاف کے مساوی نظام کی درخشاں مثالیں کثرت کے ساتھ کتب میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ بعد کے ادوار میں اگر کہیں اس کے خلاف تعامل موجود بھی ہو تو وہ اسلامی منہجِ عدل کی تعبیر نہیں ہے۔ دین اسلام کا قواعد واصول غیر متبدل اور حتمی ہے جس پہ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں مساوات اور غیر جانبداری ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مگر اس کے بالمقابل جدید قومی ریاستوں کے نظم کے حامل بعض ممالک میں عدالتی استثناء کا تصور پایا جاتا ہے جس کی دو جہات ہیں:

(1) حکمرانوں کے لیے عدالتی استثناء۔

(2) ججز کے لیے عدالتی استثناء۔

ان دونوں تصورات میں کئی چیزیں ایسی ہیں جو اسلام کے منافی ہیں۔ قومی ریاستوں میں سربراہ ریاست یعنی صدر مملکت اور اس کے نمائندگان گورنرز کو آئینی طور پہ مکمل عدالتی استثناء حاصل ہوتا ہے۔پاکستان میں بھی ان عہدوں کی حامل شخصیات کو یہ استثناء حاصل ہے۔

یہ قانون ججوں کو ان کے فیصلوں کے تحت ہونے والے کسی بھی نقصان کی صورت میں ان کو ذمہ دار ٹھہرانے سے محفوظ رکھتا ہے۔ان پر ہتک یا ہرجانے کا مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا۔سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے متعدد بیانات اور فیصلوں میں یہ بات دہرائی گئی ہے کہ ججوں کو عدالتی وفیصلہ جاتی امور میں مکمل تحفظ حاصل ہے۔

اگر کسی جج کے بارے میں خدشات ہوں اور اس پر مقدمہ کرانا ہو تو آئین میں صرف ایک راستہ رکھا گیا ہے۔ کہ صدرِپاکستان اس جج کے متعلق کوئی مقدمہ دائر کرنے کے لیے سپریم کورٹ کو خط یا درخواست لکھے۔

سربراہ ریاست اور اس کے نمائندگان کو اور اسی طرح ججز کو دیا جانے والا عدالتی استثناء کا مسئلہ شرعی اور فقہی لحاظ سے تحقیق طلب ہے جس پر تفصیل سے مختلف جزئیات کے ساتھ بات کرنے کی حاجت ہے۔

موضوع پر سابقہ کام کا جائزہ / Review of Literature

اس موضوع سے متعلق سابقہ کام کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بطور خاص اس قضیے میں کوئی خاص کام نہیں ہوا ہے جس میں پاکستان میں عدالتی استثناء کے مروج قوانین کا اسلام کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہو اور اس کی مفصل جزئیات کا تحلیلی جائزہ لیا گیا ہو۔ عمومی طور پہ اسلام کے عدالتی نظم پر کچھ کام ہوا ہے تاہم ان میں موضوعِ بحث عدالتی استثناء کا مسئلہ نہیں ہے۔عدل وانصاف کے موضوع میں مختلف پہلوؤں پر لکھی جانے والے مقالہ جات، کتب اور آٹیکلز سامنے آئے ہیں ان کے عنوانات درج ذیل ہیں:

مقالہ جات:

1. اسلام کا عدالتی نظام،(ایم فل)مقالہ نگار:مظفر علی شاہ، نگران تحقیق:مولانا غلام مصطفی قاسمی، کلیہ معارف اسلامیہ،سندھ یونیورسٹی، جام شورو،1984ء۔

زیر نظر مقالہ میں اسلام کے عدالتی نظام کے خصائص وامتیازت پر گفتگو کی گئی ہے۔ اسلام سے قبل عدل کی صورتحال کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے اس میں دورِ نبوی ﷺ اور بعد کے اسلامی ادوار کے تناظر میں عدل وانصاف کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔

2. وفاقی شرعی عدالت کے کام کا تحقیقی جائزہ، مقالہ نگار: مجیب الرحمن قریشی، نگران تحقیق: ڈاکٹر جمیلہ سڈل، شعبہ اسلامیات، پشاور یونیورسٹی، پشاور، 1995ء۔

اس مقالہ میں باحث نے پاکستان کی وفاقی شرعی عدالت کے کام کا جائزہ لیا ہے۔ پہلے اس کی تاریخ بیان کی گئی اور اس کے قیام کے اسباب پر گفتگو کی گئی۔ اس کے بعد عدالت کے شرعی فیصلوں اور سفارشات کی روشنی میں اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

3. پاکستان میں عدالتی بحران اور اسلام کا نظریہ عدل، (ایم فل) مقالہ نگار: صدف مظفر، نگران تحقیق: ڈاکٹر ممتاز احمد سالک، ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، 2007ء۔

زیر نظر مقالہ میں پاکستان کے اندر عدالتی نظام کی خامیوں پر بحث کی گئی ہے۔ پہلے اسلامی نظم کی خصوصیات بیان کی گئیں اور اس کے بعد پاکستان میں عدلیہ کے بحران کی مختلف جہات پر بات کی گئی ہے۔ بالخصوص عدل وانصاف میں تاخیر اور مقدمات کے پراسس پر سوال اٹھائے گئے ہیں۔

4. اعلی عدالتوں کے احتساب کا اسلامی طریقہ، قران و سنت اور تعامل امت کی روشنی میں تحقیقی و تحلیلی جائزہ، (ایم. فل) مقالہ نگار: محمد اشرف، نگران تحقیق: داکٹر محمد ادریس لودھی، شعبہ علوماسلامیہ، بہاءالدین زکریایونیورسٹی، ملتان، 2010ء۔

اس مقالہ میں عدالتوں کے احتساب کے نمایاں خدوخال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا مقدمہ اس بحث پر قائم کیا گیا ہے کہ قیامِ عدل کے لیے ریاست اور عدل کا نفاذ کرنے والے اداروں کو قرآن وسنت کی روشنی میں کس حد تک احتساب کی شفافیت کو یقینی بنانا چاہیے۔

5. پاکستان میں رائج عدالتی نظام کا شریعت اسلامی کی روشنی میں تحقیقی و تنقیدی جائزہ، (ایم فل) مقالہ نگار: عبدالخالق بن محمد رفیق، نگران تحقیق: محمودالحسن عارف، شعبہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، 2015ء۔

اس مقالہ کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ کیا پاکستان کا عدالتی نظام شریعت اسلامی کی اقدار کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ اس میں زیادہ تر عائلی قوانین کو بنیاد بنایا گیا ہے اور اس میں پاکستانی قوانین کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کتب:

1. احکام سلطانیہ، علی بن محمد الماوردی، دارالحدیث القاہرہ2006ء(اس کا ترجمہ مفتی انتظام اللہ شہابی نے کیا ہے مطبع سعیدی کراچی)اس کتاب کو بیس ابواب میں تقسیم کیا گیاہے۔اس کتاب میں امیر کے تقرر اور ریاست کے انتظام اور اداب حکمرانی کو موضوع بنایا گیاہے۔
2. ادب القاضی، محمود احمد غازی، ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد طبع دوم1993ء، اس کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اسلام کے نظام قضاء کو موضوع بنایا گیاہے۔
3. اسلامی ریاست کا عدالتی نظام، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، قانونی کتب خانہ، لاہور، 2009ء۔

اس کتاب میں اسلام کے عدالتی نظام کو فقہ اور خلفاء کے عملی اقدامات کی روشنی میں موضوع بنایا گیا ہے۔ چاروں مسالک کے ادب القاضی اور اس کے ساتھ عثمانی عہد تک خلافتوں کے عدالتی نظام کو مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیاہے۔

4. عدالتی فیصلے، مفتی محمد تقی عثمانی، ادارہ الفیصل، کراچی، 2012ء۔

اس کتاب میں پاکستان کی عدالتی تاریخ میں بعض ایسے فیصلوں پر بات کی گئی ہے جنہوں نے ملک کے عدالتی نظم کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بالخصوص قصاص، رجم، شفعہ، زکواۃ و عشر اور عائلی قوانین کے زمروں میں اہم فیصلوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور فیصلوں کے متون کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

5. اسلامی عدالت، مجاہد الاسلام قاضی، ادارۃ القرآن، کراچی، 2014ء۔

اس کتاب میں عہد نبوی ﷺ کی روشنی میں قضاء کے خصائص کو بیان کیا گیا ہے اس کے بعد فقہاء کے اجتہادات کی روشنی میں اسلام کے نظام عدل اور اس کے لیے اداروں کی مستقل تشکیل پر بات کی گئی ہے کیسے اسلام نے نظام عدل کی شفافیت کو یقینی بنایا۔

آرٹیکلز:

1. ضمان خطأ القاضي في حكمه(دراسة فقهيةمقارنة)،عادل بن عبد الله السعوى، مجله علوم الشريعة والدراسات الإسلامية، العدد 82 سبتمبر 2020

اس آرٹیکل میں قاضی کی غلطیوں کی اقسام کو ذکر کیا گیا ہے، اور وہ کون سے عوامل ہیں جن کی بنا پر قاضی کے فیصلے کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے۔ قاضی کا فیصلہ غلط ہونے کی وجہ سے جو اثرات پیدا ہوئے ہیں مثلا اگر کسی کا کچھ نقصان ہوا ہے اب اس نقصان کا ضامن کون ہے؟

2. پاکستان میں شرعی قوانین کا نفاذ، جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمان، القلم، جلد16، شمارہ،4، 2014ء

اس آرٹیکل میں پاکستان میں شرعی قوانین کے نفاذ کو ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح 1956، 1962 اور 1973 کے آئین میں اسلامی قوانین کو شامل کیا گیا۔ مثلا شرعی عدالتوں کا قیام، قوانین وحدود، شراب نوشی کی سزا، نظام زکاۃ و عشر کا نفاذ، سود کا استیصال، اسلامیہ یونیورسٹی کا قیام، لا کمیشن اور بعض اور اقدامات جو حکومت پاکستان نے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش پر نفاذِ شریعت اسلامیہ کے سلسلے میں کیے۔ ایک اور چیز جو اس میں ذکر کی گئی کہ اعلی عدالتوں کا لباس اور خطاب کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے۔

3. اسلام میں عدل کی اہمیت، ڈاکٹر ناہید آرائیں، العلم، جلد3، شمارہ9، 2015ء۔

اس آرٹیکل میں عدل کی لغوی اور اصطلاحی تعریف کے ساتھ اسلام میں عدل کی اہمیت کو قرآن و حدیث اور صحابہ کرام کے اقوال و اعمال سے بیان کیا گیا ہے۔ عدل کی اقسام کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلا عدل کی دو قسمیں ہیں قانونی عدل اور عمرانی عدل۔ قانون عدل وہ جو عدالتوں کے ذریعے لوگوں کو اپنے حقوق کی بازیابی کے سلسلے میں میسر آتا ہے۔ عمرانی عدل کے معنی ہیں ہر صاحب کو اس کا حق دینا خواہ سربراہ حکومت کے ذریعے ہو یا سربراہ عدالت یا کسی اور فرد کے ذریعے ہو۔

4. اسلامی ریاست میں قاضیوں کا احتساب، ڈاکٹر محمد ادریس لودھی، پشاور اسلامکس، جلد 3، شمارہ 2، 2012ء

اس آرٹیکل میں احتساب کی اہمیت کو قرآن اور احادیث اور خلفائے راشدین کے کے عمل سے واضح کیا گیا ہے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خلافت راشدہ میں عدلیہ کے احتساب کا طریقہ کار بھی وضع کیا گیا ہے ہے خلافت راشدہ کے بعد اموی اور عباسی دور میں ججز کا احتساب کو بھی واضح کیا ہے مسلم ہند اور پاکستانی قانون میں جہیز کے احتساب اب وہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔

5. اسلام میں عدلیہ کی آزادی کا تصور، ڈاکٹر انوار اللہ، فکر و نظر، اسلام آباد، جلد 34، شمارہ 4، 2013ء۔

اس آرٹیکل میں عدلیہ کی آزادی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی اپنے مقرر کردہ قاضیوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عدلیہ کی آزادی کے سلسلہ میں تمام قاضیوں کے لیے ایک نمونہ تھے۔ آپ علیہ اسلام ازاد عدلیہ کے خواہاں تھے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر کر دیا گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ نے غیر جانبدارانہ عدل کے نفاذ کے لیے سنہرے اصول وضع کئے جو کہ اس آرٹیکل میں ذکر کئے گئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ پہلے خلیفہ تھے جنھوں نے قاضیوں کے لیے معقول تنخواہ مقرر فرمائی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ انہوں نے بھی آزاد عدلیہ کے عمل کو جاری رکھا مزید اس آرٹیکل میں قاضی کی صفات بھی ذکر کی گئی ہیں اور پاکستان میں عدلیہ کی آزادی کے اوپر بھی بحث کی گئی ہے۔

6. جج پر ضمان: فقہی قواعد اور پاکستانی قانون میں تطبیق، مجلہ علوم اسلامیہ و دینیہ، جلد 3 شمارہ 2، 2018ء

اس آرٹیکل کا خلاصہ ہے کہ اگر جج سے غلط فیصلہ صادر ہونے کی صورت میں مدعی اور مدعاعلیہ کے ہونے والے نقصان کا آزالہ بھی کیا جائے گا یا نہیں؟ قواعد فقہیہ کی وضعی قانون سے تطبیق کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ ائمہ اربعہ کا جج پر ضمان کا موقف بھی ذکر کیا گیا ہے۔ قاضی کو معزول کرنے کے اسباب کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔

7. رسول اللہ ﷺ کا منہجِ عدل و قضاء، ڈاکٹر یوسف فاروقی، مجلہ تعلیم و تحقیق، جلد 1، شمارہ 4، 2019ء

اس آرٹیکل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہج عدل و قضا کو واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے دل و دماغ میں عدل و انصاف کا شعور پیدا کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم قضاء کے لیے اپنے صحابہ

کی تربیت کا اہتمام فرماتے تھے۔ جس کی احادیث میں بے شمار مثالیں موجود ہیں جو اس آرٹیکل میں ذکر کی گئی ہیں اس کے ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ میں قضاء میں مشاورت کرنے کا شعور بھی پیدا کیا اور عدل کے قیام کے لیے حقوق و فرائض کا تعین کر کے اپنے صحابہ کو سمجھایا۔

جواز تحقیق/Rationale of the study

عدالتی استثناء کا مسئلہ احتساب اور انصاف کے مروج جدید اصولوں کی روشنی میں ایک ایسا قضیہ ہے جس کی اساسات خالصتاً سیاسی نوعیت کی ہیں جن میں ریاست کی بالادستی اور اس کی اتھارٹی کو زیادہ سے زیادہ مستحکم رکھنے کی غرض کو اہمیت دی گئی ہے۔ اسی لیے ریاست کی نمائندگی کرنے والے چند مناصب کو ان کی مدتِ اقتدار کے دوران احتساب کے کٹیرے میں نہیں لایا جاسکتا۔ اسی طرح ججز کو بھی احتساب کے دائرے میں لانا مشکل ہے۔ لہذا اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس موضوع کا انتخاب کر کے مروج قانون کا شرعی اصولوں اور مسلم تاریخی تعامل کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔

بیانِ مسئلہ /Statement of the Problem

پاکستان میں ریاست کی نمائندگی کرنے والے صدر اور صوبوں کے گورنرز کو آئینی طور پہ یہ سہولت دی گئی ہے کہ جب تک وہ اقتدار میں رہیں گے ان کے خلاف کسی قسم کا کوئی مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا اور انہیں احتساب کے لیے عدالتی کٹہرے میں نہیں لایا جاسکتا۔ اسی طرح ججز کو بھی عدالتی تناظر میں کئی طرح سے مراعات ورعایات حاصل ہیں۔ یہ قانون کئی جدید قومی ریاستوں میں رائج ہے جن میں سرفہرست مغربی ممالک ہیں۔ اس قانون کی اساست خالصتاً سیاسی ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں پاکستان کے مروج قوانین کی نوعیت، اس کے اطلاقات، عدل وانصاف کے ڈھانچے پر اس کے اثرات کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

موضوع کی ضرورت واہمیت / Significance of the Study

ججز اور صدر اور گورنرز کے لیے عدالتی استثناء کے مروج قوانین نظامِ عدل کو کئی جہات سے متاثر کرتے ہیں اور شرعی وفقہی لحاظ سے اس کا جائزہ متعدد حوالوں سے اہم ہے۔ اس موضوع کو درج ذیل نکات کے ضمن میں سمجھا جاسکتا ہے:

- عوامی سطح پر اسلام کے عدل وانصاف کے عمومی تصور کا ایک خاکہ تاریخی واقعات کی شکل میں موجود ہے، لیکن اس کے ساتھ اس چیز کی بھی ضرورت ہے کہ دین اسلام کے منہج عدل کے فقہی مشمولات اور جدید ریاستی نظم کی دقیق جزئیات کے تناظر میں اس کے نقطہ نظر کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تاکہ نظامِ عدل کی روشنی میں اسلام کے انسانی حقوق کے مثالی تصور کو اجاگر کیا جاسکے۔
- یہ جاننا ضروری ہے کہ عدالتی استثناء کے قوانین کے اثرات صرف چند شخصیات کی نجی حیثیت تک محدود نہیں رہتے، بلکہ ان کے استقلالِ قضاء اور سماجی انصاف کی شفافیت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن وسنت کی ہدایات کے مطابق قضاء کا ڈھانچہ ریاست کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے جس میں غیر جانبداری اور مساوات کی بنیادی اہمیت ہے۔اس مسئلے کو مسلم تاریخی تعامل اور شرعی قواعد دونوں کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔
- قومی ریاستیں اگرچہ مساوی جمہوری اقدار کے فروغ کی بات کرتی ہیں، لیکن عدالتی استثناء کے قوانین نظامِ عدل میں طبقاتی تفریق کو راسخ کرنے کا سبب ہیں جس سے ایک طرف ریاست کی عوام پر بالادستی ثابت ہوتی ہے تو دوسری طرف اوپر کی سطح پر انسانی حقوق کا معاملہ اوجھل ہو جاتا ہے۔لہذا اس تناظر کا تفصیلی جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔
- فقہ اسلامی کے ایک قاعدے "الحصانہ القضائیہ "(عدالتی تحفظ)اور مروج پاکستانی قانون عدالتی استثناء کے مابین اطلاقات کے فرق اور ان کے مناہج کا مطالعہ سودمند ہو سکتا ہے۔
- پاکستان کے عدالتی استثناء کا قانون آئین کے بعض شقوں کے متصادم ہے جن میں شہریوں کے مابین مساوات کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے اور یہ بھی کہ ملک میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جاسکتا۔ اس قضیے کے حوالے سے عدالتوں میں بھی درخواستیں زیر سماعت ہیں۔ اس لیے یہ موضوع متنوع جہات سے قابلِ غور ہے۔
- پاکستان کی طرح بعض دیگر قومی ریاستوں میں بھی عدالتی استثناء کے قوانین موجود ہیں لیکن ان پر عملدرآمد کے لحاظ سے حالات کا فرق موجود ہے۔لہذا ایک اسلامی ملک اور معاشرہ ہونے کے ناطے یہ اہم

ہے پاکستان میں مذہبی تعلیمات کی روشنی میں ان تمام صورتوں کا جائزہ لیتے ہوئے پاکستان کے عدالتی استثناء کے قوانین کا تحلیلی تجزیہ کیا جائے۔

مقاصدِ تحقیق / Objectives of the Study

- پاکستان میں عدالتی استثناء کے مروج قوانین کا مطالعہ
- عدالتی استثناء کی قانونی وسیاسی اساسات کا مطالعہ۔
- اسلام کے منہج عدل وانصاف کے تناظر میں تجزیہ کرنا۔

سوالات تحقیق / Research Questions

- عدالتی استثناء اور اس کے عصری اطلاقات کیا ہیں؟
- پاکستان میں عدالتی استثناء کے قوانین کا ارتقاء کس طرح ہوا؟
- مروج عدالتی استثناء کے سماجی اور سیاسی مضمرات کیا ہیں؟

تحدیداور دائرہ کار موضوع / Delimitations of the Study

مقالہ ہذا میں پاکستان میں مروج عدالتی استثناء کے قواعد کی قانونی وسیاسی اساسات وعلل کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔اس ضمن میں اسلام کے نظامِ عدل ومساوات کا تجزیہ اور بالخصوص عدالتی استثناء کے قوانین کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تحلیلی تجزیہ کیا ہے۔علاوہ ازیں عدالتی استثناء کے منفی سماجی وسیاسی مضمرات واثرات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

منہج تحقیق/Research Method

اس تحقیق کا بنیادی اسلوب بیانیہ، تحلیلی اور تقابلی ہے۔عدالتی استثناء کے قانون کا مطالعہ کیا گیا ہے۔اس کی نوعیت اور اساسات کونسی ہیں۔اس کے بعد اس کے سیاسی وسماجی مضمرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اسی طرح آئین کی روشنی میں بھی اسے پرکھا گیا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی آئینی روح اور اس کے تقاضوں کی روشنی میں اس قانون کے اندر کیا تضادات ومسائل ہیں۔آخر میں شریعت کی روشنی میں اس قانون کا تحلیلی وتنقیدی مطالعہ کیا ہے کہ اس میں کون کون سے خلا ہیں اور شریعت اس کی مخالفت کیوں کرتی ہے۔

دوران تحقیق اصل مصادسے استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔اور بوقت ضرورت ثانوی مصادر سے بھی استفادہ کیا ہے۔

کتب ، مقالہ جات اورآرٹیکلز کے حصول کیلئے وکیپڈیا، گوگل سکالر ، اسلامیات کے سافٹ ویئرز اور لائبریریوں (ڈاکٹر حمید اللہ IIU آسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، نمل یونیورسٹی) کی طرف رجوع کیا۔

تمام عصری تحقیقات سے استفادہ کیا گیاہے۔

مقالہ کی تحریر اور حوالہ جات کے لیے نمل یونیورسٹی کا فارمیٹ اختیار کیا جائے گا۔

ابواب وفصول کی تقسیم وترتیب /Chapterization of Research Theam

اس مقالہ بعنوان "عدالتی استثناء پاکستان کے مروج قوانین اور اسلامی تعلیمات کا تقابلی جائزہ" میں تین ابواب کو شامل کیا گیاہے۔

پہلے باب میں عدالتی استثناء کا تعارف وار تقاء بیان کیا گیاہے۔

دوسرے باب میں پاکستان میں مروج عدالتی استثنا کے قوانین کی نوعیت اوراشکالات کا جائزہ لیا گیاہے۔

تیسرے باب مروج عدالتی استثناء کے قوانین کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تقابل اوراسکے سماجی وسیاسی مضمرات پر بات کی گئی ہے۔

باب اول

عدل اور عدالتی استثناء: تعارف وارتقاء

فصل اول: عدالتی استثناء اور اس کے اطلاقات

فصلِ دوم: عدالتی استثناء کے قوانین کا ارتقاء

فصل اول:

عدالتی استثناء اور اس کے اطلاقات

عدل عربی زبان کا لفظ ہے۔جو تین حروف پر مشتمل ہے۔ع۔د۔ل(بفتح العین) اُردو میں اس کا ہم معنی 'انصاف' اورانگریزی میں "Justice" ہے۔عدل کے لغوی معنی ہیں سیدھا کرنا، برابر کرنا ہے۔

"وضع الشئ فی محلہ" یعنی کسی چیز کو اس کا اصل مقام عطا کرنا، کسی چیز کو اس کی حقیقی جگہ پر رکھنا۔

جیسا کہ المعجم الوسیط میں ہے:"العدل:الانصاف وھواعطاءالردماله واخذماعليه"[1]

(عدل یہ ہے کہ جو شے جس کا حق ہے اس کو عطا کرنا اور جس کا حق نہیں اس سے واپس لینا)۔

لسان العرب میں ہے:

"العدل:انه مستقيم وحی ضدالجور،والعدل:ھوالذی لایميل به الھوی،العدل:الحكم بالحق"[2]

(عدل کے معنی ہیں سیدھا اور یہ ناانصافی کی ضد ہے۔عدل:یعنی وہ جو خواہشات کی طرف مائل نہیں ہوتا، عدل حق کے ساتھ فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں)۔

قرآن حکیم نے عدل کو انصاف اور فیصلوں کے ساتھ منسلک کیا ہے۔بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

العدل هو الانصاف [3]قال الله تعالى: ﴿ وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾[4]

(عدل کے معنی انصاف کے ہیں، اللہ تعالی فرماتا ہے:اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل وانصاف کے ساتھ کرو)۔

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"العدالةوالمعادلةلفظ حقيقی معنی المساواةويستعمل باعتبارالمضايفه"[5]

---

[1] ابراہیم انیس،المعجم الوسیط،(استنبول،مکتبة الاسلامیة ،2002ء)،مادہ ع،د-ل- 588/6

[2] الافریقی، محمد بن مکرم ابن منظور، لسان العرب،(ایران،مکتبة شرادب،2001ء)11/ 430

[3] بیضاوی،عبداللہ بن عمر،البیضاوی(بیروت,دارالکتب العلمیة 1998)10

[4] القرآن :النساء:58

[5] الاصفہانی،حسین بن محمد ،معجم مفردات الفاظ القرآن، (کراچی،مکتبة میر محمد،2006ء)336/2

(انصاف اور مساوات ایک حقیقی لفظ ہے جس کا مطلب مساوات ہے اور بطور اضافی (سیاق وسباق کے اعتبار) کے استعمال ہوتا ہے۔)

یعنی دونوں الفاظ ایک دوسرے کے ہم وزن اور برابر ہیں۔ سیاق وسباق کے اعتبار سے کبھی عدالہ اور کبھی معادلہ کا لفظ استعمال ہو گا۔ مگر دونوں لفظ ایک ہی مطلب کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ عدل کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"العدل هوعبارةعن الأمرالمتوسط بين طرفي الإفراط والتفريط وذلك امرواجب الرعايةفي جميع الأشياء" [1]

(عدل ایک ایسے امر متوسط سے عبارت ہے جو کہ افراط و تفریط کے درمیان میں ہے اور اس امر کا تمام اشیاء میں لحاظ رکھنا واجب ہے)۔

ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لفظ عدل کے اصل معنی برابری کرنے کے ہیں، مگر مختلف نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"فالعدل بين العبد وربه حق الله على حظ نفسه وتقديم رضاه على هواه والأجتناب للزواجر الأمتثال للأوامر،وأما العدل بين وبين نفسه فمنعها عمافيه هلاكها وعزوب العبد عن التباس ولزوم القناعة فى كل حال واما العدل بينه وبين الخلق ففى بذله النصيحة وترک الخيانة فيما قل كوثر والانصاف من نفسک لهم بكل وجه ولايكون منک الى احدمساءة بقول ولا فعل ولا سرولا فى علن"[2]

(عدل کا ایک مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے گویا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ فرد اللہ تعالی کے حق کو اپنے حظ نفس پر اور اس کی رضا جوئی کو اپنی خواہشات پر مقدم رکھے۔ اور اس کے احکام کی تعمیل اور اس کے محرمات سے مکمل اجتناب کرے۔ عدل کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے، وہ اس طرح کہ اپنے نفس کو ایسی چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو۔ ایسی خواہشات کو پورا نہ کرے جو اس کے لئے مضر ہوں، قناعت اور صبر سے کام لے اور نفس پر بلاوجہ زیادہ بوجھ

[1] الرازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب(،بیروت دارلفکر،1415ھ)ج20ص105

[2] ابن العربی المالکی (فقیہ)، ابوبکر محمد بن عبداللہ، احکام القرآن(بیروت، دارالمعرفہ، 1972ء)، 3/ 1172

نہ ڈالے۔ عدل کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان عدل کرے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے اور کسی بھی معاملہ میں کسی سے بھی خیانت نہ کرے، اپنے نفس سے سے انصاف کا مطالبہ کرے، کسی انسان کو اپنے کسی قول و فعل سے ظاہر ایا باطنا کوئی ایذا اور تکلیف نہ پہنچائے۔)

ان تعریفات کی رو سے نہ صرف انسانوں کو بلکہ کائنات کی ہر شے کو اس کے اصل مقام و منصب پر رکھنا اور اس کی اُس حیثیت کو بھی تسلیم کرنا جو اللہ تعالٰی نے اسے عطا فرمائی ہے۔ عدل کہلائے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ افراط و تفریط کے درمیان توازن قائم رکھنا عدل ہے۔

عدالت:

اُردو زبان میں عدالت کی اصطلاح عام طور پر اس جگہ یا کمرے کے لیے استعمال ہوتی ہے جہاں جج بیٹھتا ہے اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔

"أصل العدالة من,,العَدْل،، وتعني الإنصاف وإعطاء المرء،والجزاء،والنظير،والفداء"۔[1]

(عدالت کی اصل لفظِ "عدل'" ہے جس کا مطلب ہے انصاف کرنا اور فرد کو اس کا حق دینا۔ اور اسی طرح جزاء، نظیر اور قربانی کے معنوں میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔)

محمد بن عبد القادر الرازی عدالت کا مفہوم بیان کرتے ہیں:

"تعني العدالة إعطاء كلّ شخصٍ ما يستحقه، أو إعطاء كلّ فردٍ حقه، وترتبط العدالة ارتباطاً وثيقاً بالمساواة، كما تستعمل العدالة للدلالة على معيار الحق[2]۔"

(عدالت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا وہ حق مہیا کیا جائے جس کا وہ مستحق ہے۔ عدالت کی اصطلاح مساوات کے ضمن میں بھی مستعمل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے۔ اسی طرح عدالت کا لفظ حق کے معیار کے طور پہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

یعنی عدالت کا کام ہر اس مستحق کو اس کا حق دلانا جس نے عدالت سے رجوع کیا ہے۔

---

[1] إبراهيم انيس،معجم الوسيط ،421/1

[2] الرازی، محمد بن عبدالقادر، مختار الصحاح (لبنان، مكتبة لبنان،2008ء) 1/ 475

قاضی:

قاضی (انگریزی:Qadi) ایک عربی کلمہ ہے جس کا معنی لغت کے رو سے فیصلہ کرنے والا ہے اصطلاح میں اس شخص کو قاضی کہا جاتا ہے جس کو عدالت میں فیصلہ کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ قاضی قضاء سے مشتق ہے۔

ابن منظور افریقی قاضی کا لغوی معنی یوں ذکر کرتے ہیں:

"هو القاطع الامور المحكم لها وستقضى فلا اى جعل قاضيا"[1]

(اختلافی امور کو ختم کرنے والا قاضی کہا جاتا ہے۔ استقضی فلاں مطلب فلاں کو قاضی بنایا گیا۔)

ادب قاضی کی روشنی میں قاضی کی اصطلاحی تعریف یوں ہے:

" هو الذات الذى نصب و عين من قبل السطان لأجل فعل وختم الدعوى والمخصامة الوقعة بين الناس توفيقا لاحكامها والمشروعية "[2]

(قاضی سے مراد وہ شخص ہے جس کو سربراہ حکومت کی طرف سے لوگوں کے درمیان جھگڑوں، دعوی جات کی چھان بین اور اختلافات ختم کرنے کے لئے مقرر کیا جائے۔)

تعزرات پاکستان 1860ء میں جج کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"Who is one of a body of persons, which body of persons is empowered by law to give such judgement[3]"

(جج سے مراد وہ فرد ہے جس کو قانون کے مطابق کسی مسئلہ کے متعلق فیصلہ صدر کرنے کا اختیار ہو)

اسلام اور عدل:

اسلام میں تمام احکام کی بنیاد ہی عدل ہے بلکہ اسلام عدل کا ہی مذہب ہے۔ اسلام نے روز اول سے نہ صرف عدل کی ضرورت و اہمیت کو صاف الفاظ میں بیان کیا بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں عدل کی تفصیلات اور جزیات سے بھی آگاہ کیا۔ اسلام ایک ایسا مکمل نظام حیات ہے جو زندگی کے ہر میدان میں انسان کو معتدل راستہ اپنانے کا حکم دیتا ہے اور ہر قسم کی زیادتی اور ناانصافی سے روکتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں عدل کا قیام خلیفہ یا امیر کے توسط سے ہوتا ہے۔

---

[1] ابن منظور،لسان العرب،ماده قضاء،186

[2] مجلة الأحكام العدليه ماده 1785

[3] The Pakistan penal code,1860, chapter:2,Rule 19

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجابلا تفریق انصاف کرنے اور حق کا ساتھ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

سورۃ الحدید میں انبیاے کرام کی بعثت کے ساتھ میزان عدل کو منسلک فرمایا گیا ہے۔

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔﴾[1]

(ہم نے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل فرمایا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔)

مثال کے طور پر سورۃ الشوریٰ کی آیت میں آتا ہے کہ:

﴿وَقُلْ ءَامَنتُ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ مِن كِتَٰبٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ﴾[2]

(اور کہہ دیجیے کہ میں ایمان لایا اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب پر اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں)

اسی طرح سورۃ النساء میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ:

﴿وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾[3]

(اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ کرو)

قرآن کریم میں عدل کا استعمال صرف ریاستی معاملات سے ہی متعلق نہیں بتایا گیا ہے بلکہ یہ ایک انفرادی رویّے سے لے کر اجتماعی ذمہ داری تک کا عمل ہے۔ مزید برآں عدل کو معاشرتی امور کا لازمی حصّہ قرار دیا گیا۔ اس کی مثال یہ آیت: "إن الله يأمر بالعدل" مکی ہے اور مکہ میں مسلمانوں کے پاس ریاستی امور نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عدل صرف یہ نہیں ہے کہ ریاستی سطح پہ اس عمل کا لحاظ کیا جائے بلکہ انفرادی زندگی میں بھی اس کا لحاظ ضروری ہے۔

---

[1] الحدید: 25

[2] الشوریٰ:15

[3] النساء:58

عدل کا متضاد ظلم ہے جس کا معنی ہے:"وضع الشیء فی غیرموضعہ[1] "(یعنی کسی چیز کا اس کے اصل مقام سے دوسری جگہ پر رکھنا)اور یہ کام صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو علم کے نور سے بے بہرہ ہو۔اس لیے ظلم کا ایک ترجمہ اندھرا بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات کے ذریعے سے اپنی امت کو ظلم سے دور رہنے کی بار بار تلقین کی۔آپ علیہ السلام نے فرمایا:

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:إِيَّاكَ وَالظُّلْمَ، فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))[2]

(ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظلم سے بچو ظلم قیامت کے اندھروں میں سے ایک اندھرا ہے)۔

ظلم کی ادنٰی ترین شکل کو بھی اسلام گوارہ نہیں کرتا اور اس کے خاتمے کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔

چنانچہ ایک حدیث قدسی ہے: نبی مکرم ﷺ فرماتے ہیں اللہ تعالی نے فرمایا:

((يَا عِبَادِي، إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا؛ فَلَا تَظَالَمُوا))[3]

(میرے بندو!میں نے کسی پر ظلم کرنا اپنی ذات کے لیے بھی حرام کر دیا ہے اور اس کا ارتکاب کرنا تمہارے درمیان بھی حرام ٹھرا دیا ہے،لہذا ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو)۔

اسلام میں عدل کا قیام فی نفسہ مطلوب ہے۔جیسا کہ اسلام میں عدل کا قیام ایک بنیادی حیثیت و مقام رکھتا ہے۔لہذا اس قیام میں جغرافیاہی حدود کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے،نہ ہی ملک و قوم کے فرق کو۔حتٰی کہ اگر دشمن سے بھی واسطہ پڑھ جائے تو عدل وانصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

سورۃ النساء کی آیت میں مومنین کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ عدل کے واسطے سچی گواہی دیں خواہ اس گواہی کی وجہ سے ان کا اپنا یا ان کے عزیز واقارب کا نقصان ہی کیوں نہ ہو رہا ہو:

---

[1] الاصفهانی،حسین بن محمد ،معجم مفردات الفاظ القرآن ،326

[2]البخاری،محمد بن اسماعیل ،الجامع الصحیح ، باب صدق الایمان(قاهره، دارالمنهاج،2002ء) ح:2447

[3]القشیری،مسلم بن حجاج،الجامع الصحیح ،باب الحث علی المبادره(بیروت، مکتبةالعلمیة،1994ء) ح:6572

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ---﴾[1]

(اے ایمان والو انصاف پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہو اللہ کے لیے گواہی دو چاہے وہ تمہارے اپنے یا تمہارے والدین یا قریبی عزیزوں کے خلاف کیوں نہ ہو۔)

اسی لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور بالخصوص خلفاء راشدین نے عدلیہ کے استحکام اور نظام عدل سے متعلق اصولی ہدایات پر سختی سے عمل کیا۔ اسی سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام تفصیلی ہدایات ایک بہت ہی اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لیے فقہاء نے ان خطوط کو عدلیہ میں دستور العمل قرار دیا۔

اصل میں یہ نبی ﷺ کی تعلیمات ہی تھیں جس کی بدولت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایک ایسے مضبوط عدالتی نظام کی بنیاد رکھی جو ہر طبقہ اور فرد (مسلمان و کافر) کے لیے عدل و انصاف کا ضامن بنی۔ یہی وہ تربیت تھی جس کی بدولت ایک صحابی حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے ایران کے بادشاہ کے دربار میں بے خوف و خطر ہو کر یہ اعلان کیا کہ:

((اللَّهُ ابْتَعَثْنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللَّهِ، وَمِنْ ضِيقِ الدُّنْيَا إِلَى سِعَتِهَا، وَمِنْ جَوْرِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ))[2]

(اللہ تعالی نے ہمیں بھیجا ہی اس لیے ہے کہ ہم بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ تعالی کی بندگی میں داخل کر دیں۔ انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت میں لے جائیں اور مختلف ادیان اور ظالموں کے ظلم سے چھڑا کر اسلام کے عدل کی طرف پھیر دیں۔)

قرآن مجید اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ عدل کا دائرہ کار وسیع ہے اور یہ زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے۔ اگر نبی مکرم ﷺ کی اس حدیث کو پیش نظر رکھ کر تھوڑا سا غور و فکر کیا جائے تو اس حدیث میں عام لوگوں کے ساتھ ساتھ امراء اور حکام بھی شامل ہیں۔ حدیث رسول ﷺ ہے:

---

[1] النساء:135

[2] ابن کثیر، اسمعیل بن عمر، البدایہ والنہایہ(قاہرہ، مطبعۃ السعادہ،1998ء)39/7

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ أَلاَ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ فَالأَمِيرُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَ هُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَ هُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُمْ وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ بَعْلِهَا وَ وَلَدِهِ وَ هِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ وَالْعَبْدُ رَاعٍ عَلَى مَالِ سَيِّدِهِ وَ هُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُ أَلا فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))[1]

(ابن عمر رضی اللہ عنھما نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ پھر جو کوئی بادشاہ ہے وہ لوگوں کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کا سوال ہو گا۔ اور آدمی اپنے گھر والوں کا حاکم ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہو گا اور عورت اپنے خاوند کے گھر کی اور بچوں کی حاکم ہے، اس سے اس کے بارے میں سوال ہو گا اور غلام اپنے مالک کے مال کا نگران ہے اور اس سے اس کے متعلق سوال ہو گا۔ غرضیکہ تم میں سے ہر ایک شخص حاکم ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کا سوال ہو گا۔)

عدل عالمی صداقتوں میں سے ایک ہے۔ ہر مذہب اور قانون میں عدل کے بارے میں واضح ہدایات موجود ہیں مگر اس کے ماننے والوں اور پیروکاروں نے اس کی تشریح اور توضیح میں بڑا فرق پیدا کر دیا۔ حکمرانوں، ججوں اور اونچی ذات کے لوگوں نے اپنے آپ کو واجب العمل سزا و عتاب سے مستثنیٰ قرار دیا جس سے عدل و انصاف کے وہ اثرات و نتائج رونما نہیں ہوتے جن کی بنیاد پر کوئی بھی معاشرہ امن و اسکون کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

قانونی عدل:

قانونی عدل وہ ہے جو لوگوں کو عدالتوں کے ذریعہ اپنے حقوق کی بازیابی کے سلسلے میں ملتا ہے۔ اس کا مطلب ہے جب کوئی مظلوم شخص کسی جج یا حاکم کے پاس اپنی کوئی فریاد لے کر جائے تو بغیر رشوت اور سفارش کے اُسے انصاف مل سکے۔ کسی بھی شخص کو اس کی غربت اور معاشرے میں کم حیثیت اس کے انصاف کی راہ میں اثر انداز نہ ہو۔ قانونی طور پہ عدل کا لفظ ان چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جن کا اِدراک حواسِ ظاہرہ سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد عبد الجواد محمد کے نزدیک:

[1] السجستانی ،ابوداود، سلمان بن الاشعث،سنن ابوداود،باب خیر متاع الدنیا(انقرہ، دار انقرہ للکتب،2005ء) ح:2928

"ان القانون يعنى النظام الثابت وعلى ذالک فاالنظام تعريف القانون، قال: وكلمة قانون يونانية الأصل وانتقلت الى الاتنينة ثم الى فرانسة ومعناها القاعده"[1]

(قانون سے مراد مستحکم نظام ہے اور اسی کے مطابق یہ نظام قانون کی تعریف ہے۔انہوں نے کہا: لفظ قانون یونانی زبان کا لفظ ہے پھر لاطینی زبان میں چلا گیا اور پھر فرانسیسی زبان میں۔اور اس کا معنی ہے اصول، قاعدہ۔)

چارلس سمتھ اس کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:[2]

"Equal distribution of right in expressing opinions, fair representation of facts merit or demerit: equality and impartiality."

(رائے کے اظہار میں حق کی مساوی تقسیم، حقائق کے حوالے سے حق کو بنیاد بناتے ہوئے منصفانہ نمائندگی جس میں برابری اور غیر جانبداری کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔)

وشکی(Vishki) نے لکھا ہے:

'Law is the name of a set rules regarding the customs and tradition of a nation.The power of the stste confirms it and its power protects it[3]"

(قانون کسی قوم کے رسم ورواج اور طرز عمل سے متعلق اصولوں کے ایک مجموعے کا نام ہے۔رساست کا اختیار اس کی طاقت سے تصدیق کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔)

مندرجہ بالا تعریفات کی بناپر کہا جاسکتا ہے کہ عدل کا مفہوم مختلف مناسبتوں سے مختلف ہوتا ہے۔

عدل یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے ربّ کے درمیان عدل کرے، یعنی اللہ کے حق کو اپنی خواہش پر مقدم رکھے۔

اپنی ذات کے ساتھ عدل کرے، اپنے نفس کو ایسی تمام باتوں اور چیزوں سے بچائے رکھے جن سے جسمانی و روحانی ہلاکت واذیت کا خطرہ ہو۔اور اپنی ذات اور مخلوق کے درمیان عدل کرے تمام مخلوقات سے ہمدردی و خیر خواہی کا برتاؤ کرے۔

---

[1] محمد عبدالجواد محمد،التشريعى فى المملكة العربية السعودية ،الطبعة الاولى،ص14

[2]Charles Smith, 20th Century Encyclopaedia, A library of universal knowledge (London, Oxford Press,2001 p:4/173

[3]Quoted by good hartin ,New outlineof modern knowledge,P582

ہمارے ہاں المیہ یہ کہ ہم نے عدل کو صرف اور صرف عدالت کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ کوئی شخص بھی اپنا محاسبہ کرنے کو تیار نہیں۔

نعیم صدیقی قانونی عدل کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کسی بھی نظام حکومت کا چلنا اس کے دو وظائف کے صحیح طور پر انجام پانے پر منحصر ہے۔ ایک یہ کہ اس کا دفاع مضبوط رہے، دوسرے یہ کہ اس کا عدالتی نظام ٹھیک طریق سے کام کرتا رہے اور اس کے قوانین نافذ ہوتے رہیں۔ پہلا وظیفہ بیرونی حملوں سے بچاؤ کے لیے اور دوسرا وظیفہ اندرونی مفاسد کی روک تھام کے لیے ہے۔"[1]

قانونی عدل کی جو عمومی تعریف کی جاتی ہے اس میں عدل بمعنی انصاف (Justice) کے استعمال ہوتا ہے اور اس میں انصاف کی بنا ادارہ جاتی ہوتی ہے جو قانونی شکل میں مرتب ہوتی ہے اور موقع محل کی مناسبت سے اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جبکہ عدل کی ایک تعریف برابری (Equity) کے معنی میں کی جاتی ہے جو ضروری نہیں کہ قانونی عدل کی شکل کے ساتھ بھی مطابقت رکھتی ہو[2]۔

عدل اور قانونی عدل کے مابین لطیف فرق ہے۔ اس کی مثال یہ دی جاتی ہے کہ چوری کے جرم میں ہر شخص کو ایک جیسی سزا دی جائے گی۔ یہ قانونی عدل ہے، چاہے چوری کرنے والا اپنی بھوک مٹانے کے لیے روٹی چوری کرے یا عادتاً یہ عمل سرانجام دے۔ یعنی کہ مجبوری کی حالت میں ہو یا جرم کی حیثیت و نیت سے، بہر طور یہ ایک مساوی درجے کا عمل ہے اور دونوں اشخاص کو ایک جیسی سزا دی جائے گی۔ یہ قانونی عدل ہے۔ جبکہ اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ حالات و واقعات کی جانچ پڑتال کو بھی مد نظر رکھا جائے اور اسی حساب سے کوئی حکم یا فیصلہ سنایا جائے۔

قانونی عدل ادارہ جاتی حیثیت میں سماج پر ریاست کی جانب سے نافذ العمل ہوتا ہے، اس کا مصدر اگرچہ عدل کی نظری مباحث ہوتی ہیں لیکن قانونی عدل کی تنفیذ کے عمل میں ان باریکیوں کو مد نظر رکھنا ضروری خیال نہیں کیا جاتا جو عدل کی نظری مباحث میں غیر قانونی شکل کا خاصہ ہوتی ہیں۔

---

[1] نعیم صدیقی، محسن انسانیت (لاہور، عکس پبلی کیشنز، 2009ء)، 332

[2] زید مصطفی، المصلحہ فی التشریع الاسلامی (قاھرہ ،دارالنماء، 1989ء) 121

ڈاکٹر مجید خدوری[1] اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"العدل القانون هو العدل طبقاً للقانون (الشريعة)۔ والعدل مصطلح قانونی، ويتطابق معناه مع معنى القانون۔ لكن معنى العدل قد توسع كثيراً ليشمل لا المظهر الشرعی (القانونی) وحسب، بل مظاهر اخرى ايضاً۔ وهكذا قد يتطابق العدل والقانون لأن بعض عناصر العدل قد تكون مضمنة فی جوهرالقانون[2]۔"

(عدل قانون تشریعی وادارہ جاتی حیثیت میں عدل ہی کہلاتا ہے۔ عدل اپنے آپ میں ایک قانونی اصطلاح ہے اور قانون کے ہم معنی ہے۔ البتہ عدل کا معنی کچھ حد تک توسع رکھتا ہے کہ یہ نہ صرف تشریعی (ادارہ جاتی) مظہر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ دیگر کچھ مظاہر پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔ اس طرح ممکنہ طور پہ عدل اور قانون دونوں میں مطابقت ہو سکتی ہے کہ عدل کے بعض عناصر قانونی روح کا حصہ ہو سکتے ہیں۔)

ڈاکٹر مجید خدوری کے مطابق اسلامی تناظر میں قانونی عدل میں قانون وہ مروج وضعی اصول وضوابط نہیں ہوتے جو سماج میں ماہرین طے کرتے ہیں بلکہ وہ دین کی روح سے مطابقت رکھتے اور فقہ سے کشید ہوتے ہیں۔ اس لیے شریعت اسلامی میں قانونی عدل اور عدل کے مابین کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔

اسلام میں قانون کا دین کے ساتھ نہایت گہرا ربط موجود ہوتا ہے اور یہ دونوں (قانون اور دین) اللہ تعالی کے ارادے اور اس کے عدل کی تعبیر ہوتے ہیں۔

مسلم سیاسی فقہ میں قانونی عدل کی توضیح کے حوالے سے استبدادِ عادل[3] کی فکر نمایاں نظر آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج میں شرعی یا مروج وضعی قوانین کو لاگو کرنے کے لیے ریاست کی جانب سے سختی کا اظہار کیا جانا چاہیے تاکہ معاشرے میں ہمواریت باقی رہے۔ البتہ یہ سختی تنفیذی نوعیت کی ہوتی ہے جسے استبدادِ عادل کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اثر بھی نقل کیا جاتا ہے کہ:

---

[1] مصنف عراق سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلامی سیاسیات ان کا تخصص ہے اور انڈیانا یونیورسٹی امریکا میں پڑھاتے رہے ہیں۔

[2] مجید خدوری، مفهوم العدل فی الاسلام (دمشق، دارالحصاد، 2007ء) 162

[3] عدل پسند سخت گیر

''إِنَّ اللَّهَ لَيَزَعُ بِالسُّلْطَانِ أَكْثَرَ مِمَّا يَزَعُ بِالْقُرْآن[1]۔''

(لوگ قرآنی تعلیمات کے نہیں بلکہ طاقت کے تابع ہوتے ہیں اور اسی کے خوف سے عمل کرتے ہیں۔)

ارسطو نے بھی اپنی کتاب پالیٹکس کے پانچویں باب میں استبدادِ نافع [2]کی اصطلاح استعمال کی ہے یہ تقریباً استبداد عادل کے ہم معنی ہے ارسطو اگرچہ استبداد اور جبر کا سخت مخالف ہے لیکن معاشرتی فساد کو بغاوت یا انقلاب کے رستے کے بجائے تدریجی اصلاحی عمل کے ذریعے ٹھیک کرنے کا قائل ہے اس لیے معاشرے میں اگر بدامنی اور فساد پھیل جائے اس کو وقتی ضرورت کے طور پر استبداد نافع کے ذریعے ختم کرنا چاہئے۔ ارسطو استبداد نافع کو حکومت کا مستقل و امتیازی صف نہیں گردانتا بلکہ ایک محدود عرصے کی ضرورت تصور کرتا ہے۔[3]

اسلامی حکومت میں ریاستی ڈھانچے کے لیے عدل کو ایک لازمی شرط کے طور پہ دیکھا جاتا ہے کہ قوانین میں عدل کی روح نمایاں ہونی چاہیے بلکہ عدل کو قوانین کا محور بنایا جاتا ہے۔ فقہاء حاکم کے لیے عادل ہونے کی شرط کو ضروری قرار دیتے ہیں اور عدل کے فوائد پر بھی گفتگو فرماتے ہیں کہ اس کے بغیر سلطنت میں امن کا قیام ممکن نہیں ہو سکتا، وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا جوہری مقصد رعایا کی بہبود و فلاح ہوتا ہے، وہ خلیفہ کو بھی تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر وہ عدل و انصاف قائم نہیں کرے گا تو عوام کے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا ہونے لگے گی جو اس کے اقتدار کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔

---

[1] الماوردی، علی بن محمد ، ادب الدنیا والدین (قاهره ، دارالمنهاج، 2001ء)135

[2] انصاف پسند سخت گیر

[3] احمد لطفی ،سید ،السیاسه الدارالقومیه(لبنان، للطباعه والنشر،2011ء) 407

عدالتی استثناء اور اس کا قانونی مفہوم:

استثناء کا لغوی مفہوم لپٹنا، موڑنا اور الگ کر دینا ہے۔ مختار الصحاح میں ہے:

"الاستثناء من ثنى الشيء ثنياً: إذا ردّ بعضه على بعض، يقال: ثنيت الشيء أثنيه ثنياً- من باب رمى إذا عطفته ورددته، وثنيته عن مراده-"[1]

(استثناء کا مادہ ہے 'ثنیٰ' کہا جاتا ہے کہ ثنى الشيء ثنياً یعنی کہ میں نے فلاں چیز کو ایک طرف کر دیا یا اسے ہٹا دیا۔ یہ پھینکنے اور دوسری طرف موڑنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے کہ جب کسی فرد یا چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی جانب موڑ دیا جائے یا پھینک دیا جائے تو کہا جاتا ہے ثنيت الشيء أثنيه ثنياً-)

جیسا کہ مثال ذیل کا جملہ ہے: "میرے پاس قوم آئی سوائے زید کے"۔

اس مثال میں زید کو حرف استثناء سوائے کے ذریعے قوم سے جدا کیا گیا ہے۔ جس کو جدا کیا جائے اس کو مستثنیٰ اور جس سے جدا کیا جائے اس کو مستثنیٰ منہ اور حرف جس کے ذریعے استثناء کیا جائے اس کو حرف استثناء کہتے ہیں۔ جیسے کہ مذکورہ بالا مثال میں "قوم مستثنیٰ منہ "زید" مستثنیٰ اور "سوائے" حرف استثناء ہے[2]۔

اسی طرح کہا جاتا ہے:

"ما بقي مكان فارغ غيرَ جانب بعيد"

(سوائے دور کی ایک جگہ کے کوئی اور جگہ خالی نہیں ہے۔)

استثناء کی اصطلاحی اور لغوی تعریف کے مابین ترادف پایا جاتا ہے۔ اس کی دلالت حروف استثناء کے لیے ہوتی ہے جبکہ فقہاء و اصولیین کے ہاں بھی اس کی دلالت کسی حکم میں سے بعض چیزوں کے کلی یا جزئی اخراج کے لیے ہوتی ہے۔

اگرچہ قانون کی کتب میں عدالتی استثناء کی تعریف کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، لیکن مجموعی طور پہ ججز کے معاملے میں ان سب کی مراد استقلالِ قضاء کے لیے کی جانے والی قانونی کوششیں ہیں جن میں بعض امور کو اس طرح لاگو کیا گیا ہے کہ اس سے عدالتی نظام کی شفافیت کو یقینی بنایا جا سکے اور اس پر کوئی شبہ پیدا ہونے کا خدشہ نہ ہو۔

---

[1] الرازی، محمد بن عبدالقادر، مختار الصحاح، 439/1

[2] ایضا:

عدالتی استثناء کی اصطلاح کا استعمال عام طور پہ دو حوالوں سے کیا جاتا ہے[1]۔

i. اعلی عدالتوں کے ججز کا اپنے فیصلوں کے تناظر میں ہر قسم کے مقدمے، ہرجانے اور نقصان کی ادائیگی سے محفوظ متصور ہونا۔

ii. دوسری قسم کے لیے قانونی استثناء کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ اگرچہ اپنے مصدر کے اعتبار سے دونوں انواع میں آئینی سطح پر استثناء موجود ہوتا ہے۔ دوسری قسم میں ریاست کے سربراہ (صدر) اور اس کے نمائندگان (صوبائی گورنرز) کو اپنی مدت حکومت کے دوران مقدمات کا سامنا کرنے یا گرفتاری سے استثناء حاصل ہوتا ہے۔

عدالتی استثناء کی اصطلاح کے لیے عام طور پہ Judicial Immunity یا Legal Exception کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ صرف استثناء بمعنی تحفظ کے لیے صرف Immunity یا بعض اوقات Privilege استحقاق کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو عدالتوں میں فیصلہ کرنے والے سرکاری ججز کو حاصل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر طلال الہتار اس کی تعریف کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"هناك بعض الموظفين العاملين تطبق على هم قوانين خاصة،تلك هي إرادة الشرع، تارة بغية تأمين اكثر فعالية لبعض فئات الموظفين وجعلهم يتمتعون بخصانة اكثر اتساعاَ۔"[2]

(سرکاری اداروں میں بعض عاملین ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے مخصوص قوانین وضع کیے جاتے ہیں، یہی شریعت کا مقتضا ہے، اس کا مقصد ان عاملین کو تحفظ فراہم کرنا ہوتا جس کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔)

اس قانون کا مقصود عدالتی شفافیت کو یقینی بنانا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ججز بالکل آزاد ہیں کہ وہ مرضی کے ساتھ جیسے بھی فیصلے کریں اس کی انہیں آزادی میسر ہے۔ بلکہ شریعت میں اس سے مقصود صرف یہ ہے قضاۃ کے درست فیصلوں پر کسی نوع کی اثر انگیزی کو روکا جاسکے اور عوام میں عدلیہ کے اعتماد کو بحال رکھا جاسکے۔ اسی طرح وضعی قوانین میں بھی اس نوع کی شرائط کا مقصود یہ ہے کہ ججز اپنے فیصلوں میں ان قوانین پر عملدرآمد کو مستحکم بنائیں جو معاشرے میں انصاف کو مضبوط بناتے ہیں اور مساوات کو فروغ دیتے ہیں۔ گویا شریعت اسلامی اور وضعی قوانین

[1]Muhammad Munir, "Precedent in Islamic Law with Special Reference to the Federal Shariat Court andthe Legal System in Pakistan، Islamic Studies 47:4 (2008), 445-482

[2]جمال مرسی بدر،مسؤلیہ الموظفین ومسؤلیۃ الدول (اسکندریہ، دارالمطبوعات الجامعیہ،2004ء)، 113

دونوں اس حوالے سے متفق ہیں کہ ججز پر کسی قسم کی اثر اندازی نہیں ہونی چاہیے اور انہیں آزادانہ طور پہ فیصلے کرنے کا اختیار وماحول میسر آنا چاہیے[1]۔

ایک جدید قومی، جمہوری یا سیکولر ریاست میں جج اس بات کے پابند ہوتے ہیں کہ وہ ریاست کی جانب سے مرتب کیے گئے قوانین پر عملدرآمد کرنے اور ان کے مطابق فیصلے کرنے کے پابند ہونگے۔ اسی طرح ایک اسلامی ریاست میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جج اپنے فیصلوں اور تحکیم کے عمل میں کسی طرح کے زور کو جگہ نہیں دیں گے اور عوام میں شریعت کے مطابق انصاف کو یقینی بنانے کو اہمیت دیں گے۔

اسلامی ریاست اور جدید سیکولر ریاست دونوں میں ججز کو کچھ حدود کا پابند بنایا جاتا ہے۔ انہیں اس کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ججز ان حدود وقیود کی پاسداری کرتے ہیں اور بظاہر ان پر کسی قسم کا شبہ وارد نہیں ہے تو ان کے فیصلوں پر انہیں موردالزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ریاست ان کے تحفظ کی ذمہ دار ہوگی۔ البتہ اگر ان سے کوئی ایسی چیز سرزد ہو کہ جس سے ان کے انصاف پر شبہ ہو، وہ رشوت لیں یا کسی بھی نوع کے فائدے کے لیے عدل نہ کریں تو ججوں کو سزا دی جائے گی اور ان کا سخت محاکمہ کیا جائے گا۔

"ومن هنا ان القوانين الوضعية تتفق مع الشريعة الاسلامية فيما اذا اخل القاضى بواجباته، او اخذ الرشوة، او غش فى الحكم ولكن تختلف الوقوانين الوضعية عن الشريعة الاسلامية فى التشريع، فان الشرع فى التشريع الاسلامى هو الله عزوجل ولايجوز لاى سلطة ان تتخلى عن سبل الشريعة الاسلامية، واما القوانين الوضعية فهى من تقنين المجالس القانونية والدستورية۔"[2]

(اس سے واضح ہوتا ہے کہ وضعی مروج قوانین اور شریعت اسلامی دونوں اس حوالے سے متفق ہیں کہ اگر قاضی اپنی ذمہ داریوں سے بے اعتنائی برتے، رشوت لے یا فیصلہ کرنے میں دھوکہ دہی سے کام لے تو اسے سزاوار سمجھا جائے گا۔ البتہ دونوں اس زاویے سے اختلاف رکھتے ہیں ان کا شریعت میں تقنین کا اصل مرجع اللہ تعالی کی ذات ہے اور کسی بھی منصب کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس سے بے اعتنائی برتے، جبکہ وضعی قوانین میں دستوری مجالس قوانین طے کرتی ہیں۔)

[1] جمال مرسى بدر، مسؤليه الموظفين ومسؤلية الدولة، 125

[2] الموسوعة القانونيه العراقيه (قاهره ،ايتراک للنشر، 2001ء)، 304/1

فقہ اسلامی میں عدالتی استثناء کا تصور:

عدالتی استثناء کی اصطلاح عام طور پہ ججز اور ریاستی سربراہان دونوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ البتہ اس کا یہ استعمال مروج قوانین کے زمرے میں ہوتا ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے ججوں کے لیے جو مخصوص قوانین ترتیب دیے گئے ہیں ان کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے جتنا کہ وضعی قوانین میں پایا جاتا ہے۔ شریعت اسلامی میں اس کے لیے جو مقصد بتایا گیا ہے وہ استقلالِ قضاء[1] کا ہے۔ اس لیے ججوں کے لیے وضع کیے گئے قوانین کو الحصانہ القضائیہ[2] کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہے عدالتی تحفظ، نہ کے عدالتی استثناء[3]۔

ججز کے برخلاف حکام کے لیے فراہم کیے گئے مروج عدالتی استثناء کو دین اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ شرعی نقطہ نظر سے حکام اور عام لوگ برابر ہیں۔ ان پر مقدمہ بھی دائر کیا جاسکتا ہے اور مدت حکومت کے دوران ان کو عدالت میں پیش ہونے کا استثناء بھی حاصل نہیں ہوتا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو انہوں نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے:

"أَيُّهَا النَّاسُ، قَدْ وُلِّيتَ عَلَيْكُمْ وَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ، فَإِنْ أَحْسَنْتُ فَأَعِينُونِي، وَإِنْ أَسَأْتُ فَقَوِّمُونِي، أَطِيعُونِي مَا أَطَعْتُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ، فَإِذَا عَصَيْتُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَلَا طَاعَةَ لِي عَلَيْكُمْ۔"[4]

(اے لوگو: میں تم پر حکمران بنایا گیا ہوں اور تم سے برتر نہیں ہوں، اگر اچھا کروں تو میری مدد کرنا، اگر غلطی کروں تو میری اصلاح کرنا، اس وقت تک میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں، جب میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کروں تو تم پر میری اطاعت کرنا لازم نہیں۔)

اس اثر سے پتہ چلتا ہے کہ دین اسلام میں حکام اور سربران ریاست کے لیے کوئی عدالتی استثناء نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے اسلامی فقہی ذخیرے میں عدالتی استثناء کی اصطلاح موجود ہی نہیں ہے۔

---

[1] عدالتی خود مختاری

[2] عدالتی تحفظ

[3] رحاب شادیہ، الحصانہ القضائیہ (بیروت، دارالمنہل، 2001ء) 74 (رحاب شادیہ الجزائر میں جامعہ بطنہ کے شعبہ قانون میں پروفیسر ہیں۔)

[4] ابن اثیر، علی بن محمد، الکامل فی التاریخ (دارالکتاب العربی بیروت 1997ء) 192/2

یہ اسوہ حسنہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات ہیں کہ حکام اور عام لوگ قانون کی نظر میں مساوی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں اور ان کے مابین کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ حتی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو بدلے کے لیے پیش کر دیتے تھے۔

((عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: بَيْنَمَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْسِمُ قَسْمًا أَقْبَلَ رَجُلٌ فَأَكَبَّ عَلَيْهِ، فَطَعَنَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعُرْجُونٍ كَانَ مَعَهُ، فَجُرِحَ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «تَعَالَ فَاسْتَقِدْ» فَقَالَ: بَلْ عَفَوْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ))[1]

(حضرت ابو سعید خدری رضي الله عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ مال غنیمت تقسیم فرمارہے تھے اس دوران اچانک ایک شخص آپ ﷺ کی طرف جھکا جس سے اس کے چہرے پر کوئی شے لگ گئی تو آپ ﷺ سے اس شخص کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آؤ اور بدلہ لے لو، جواب میں اس نے کہا کہ میں نے معاف کر دیا۔)

حکام و سربراہان ریاست کی طرح ججوں کے لیے بھی عدالتی استثناء کا تصور فقہ اسلامی میں موجود نہیں ہے۔ دین میں ولایتِ قضاء خلافت کے منصب سے مستمد ہوتی ہے۔ جس طرح خلیفہ عوام کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان میں انصاف و مساوات کو قائم رکھے اور اگر وہ اس ذمہ داری کے ادا کرنے کا نااہل ہو یا عمداً اس میں خیانت کا مرتکب ہو تو اس کو موارد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے اور اس کی سرزش کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جج کا معاملہ ہے کہ اس پر لازم ہے کہ اس کے پاس جو عوامی مسائل آئیں وہ ان میں انصاف قائم کرے ورنہ اسے عہدے سے معزول کیا جاسکتا ہے[2]۔

اسلامی ریاست میں استقلالِ قضاء کا معاملہ نہایت حساسیت کا حامل ہے۔ تاکہ عوام اور معاشرے میں ظلم و جبر کا راستہ روکا جاسکے اس کے لیے ججز کو کچھ حقوق دیے گئے ہیں جنہیں فقہ میں الحصانہ القضائیہ کے قوانین کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا مقصد استقلالِ قضاء ہے۔ اسلام میں ججوں کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کے لیے کسی نقصان کے ذمہ دار نہیں ہوں گے جب تک وہ عمداً کوئی غلطی کا ارتکاب نہ کریں۔ اور ججوں کے جان و مال کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہے تاکہ وہ بغیر کسی خوف و خطر کے فیصلے کر سکیں۔ البتہ اگر ان کی دیانت میں شبہ پایا جائے یا کوئی شاہد ہو جسے معلوم ہو کہ انہوں نے کسی ناجائز امر کا ارتکاب کیا ہے تو انہیں معزول کیا جائے گا اور نقصان کا ازالہ بھی

[1] السجستانی،ابوداود،سنسن ابوداود،باب السلم، ح: 4536 ضعیف عند البانی رحمۃ اللہ علیہ

[2] رحاب شادیہ ,الحصانہ القضائیہ، 121

کرایا جائے گا۔ اس کے بر خلاف اگر جج سے غلطی سرزد ہو جائے مگر وہ جان بوجھ کر نہ ہو تو اس کا ازالہ ریاست کے ذمہ ہو گا کہ وہ بیت المال سے ادا کرے، یا پھر فریق مخالف سے کہ جس کے حق میں فیصلہ دیا گیا۔

ابن عابدین لکھتے ہیں:

"ان خطا القاضی تارة یکون فی بیت المال وهو اذا اخطا فی حد ترتب علیه تلف نفس او عضو وتارة یکون فی مال المقضی له، وهو اذا اخطا فی قضائه فی الاموال وتارة یکون هدراً وهو اذا اخطا فی حد ولم یترتب علی ذلک تلف نفس او عضو کحد شرب مثلاً وتارة یکون فی ماله ای فی مال القاضی اذا تعمد الجور۔"[1]

(قاضی کی خطا کبھی بیت المال کے معاملات کے ساتھ جڑی ہو سکتی ہے جب وہ کسی نفس یا عضو کے ضیاع میں ملوث ہو اور کبھی اس کی خطا اس شخص کے مال سے متعلق ہو سکتی ہے جس کے حق میں اس نے فیصلہ دیا جب وہ مالی معاملات میں کوئی فیصلہ صادر کرے، یا پھر اس کی سنائی سزا ہدر و مباح کے متعلق ہو سکتی ہے کہ جب وہ کوئی حد کی سزا سنائے مگر اس سے جان یا نفس کا ضیاع نہ ہو جیسا کہ شراب کی حد، جبکہ اس کی غلطی کا تعلق کبھی اس کے اپنے مال سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ جان بوجھ کر غلط فیصلہ سنائے۔)

فقہاء اس بابت ایک حدیث مبارکہ سے استدلال کرتے ہیں:

((عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ أَبَا جَهْمِ بْنَ حُذَيْفَةَ مُصَدِّقًا فَلَاجَّهُ رَجُلٌ فِي صَدَقَتِهِ، فَضَرَبَهُ أَبُو جَهْمٍ، فَشَجَّهُ ، فَأَتَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالُوا: الْقَوَدَ يَا رَسُولَ اللهِ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَكُمْ كَذَا وَكَذَا» فَلَمْ يَرْضَوْا، فَقَالَ: «لَكُمْ كَذَا وَكَذَا» فَلَمْ يَرْضَوْا، فَقَالَ: «لَكُمْ كَذَا وَكَذَا» فَرَضُوا، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنِّي خَاطِبٌ الْعَشِيَّةَ عَلَى النَّاسِ وَمُخْبِرُهُمْ بِرِضَاكُمْ» فَقَالُوا: نَعَمْ، فَخَطَبَ رَسُولُ اللهِ فَقَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ «إِنَّ هَؤُلَاءِ اللَّيْثِيِّينَ أَتَوْنِي يُرِيدُونَ الْقَوَدَ، فَعَرَضْتُ عَلَيْهِمْ كَذَا وَكَذَا فَرَضُوا، أَرَضِيتُمْ؟» قَالُوا: لَا، فَهَمَّ الْمُهَاجِرُونَ بِهِمْ، فَأَمَرَهُمْ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَكُفُّوا عَنْهُمْ، فَكَفُّوا، ثُمَّ دَعَاهُمْ فَزَادَهُمْ، فَقَالَ: «أَرَضِيتُمْ؟» فَقَالُوا: نَعَمْ، قَالَ: «إِنِّي

[1] ابن عابدین، االشامی،محمد بن امین،تکملہ ردالمختار(لبنان، مکتبہ نشور،2017ء)، 35/1

خَاطِبٌ عَلَى النَّاسِ وَمُخْبِرُهُمْ بِرِضَاكُمْ» قَالُوا: نَعَمْ، فَخَطَبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: «أَرَضِيتُمْ؟» قَالُوا: نَعَمْ[1]))

(حضرت عائشہ رضي الله عنها سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابی ابو جَہْم بن حذیفہ رضي الله عنہ کو زکاۃ جمع کرنے کے لیے والی بنا کر ایک علاقے کی طرف بھیجا۔ اس دوران ایک شخص نے اپنا حصہ دینے سے انکار کیا تو اسے حضرت ابو جہم حذیفہ رضي الله عنہ نے اسے کسی شے سے مارا۔ جس پر اس قبیلے کے لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ انہیں بدلہ چاہئے۔ رسول الله ﷺ نے انہیں کچھ مال دینے کی پیش کش کی کہ یہ لے لو، انہوں نے کہا کہ یہ انہیں قبول ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضي الله عنهم کو جمع کر کے انہیں شاہد بناتے ہوئے قبیلہ والوں سے فرمایا کہ میں نے تم لوگوں کو اس غلطی کے بدلے اتنا مال دیا، کیا تم راضی ہو؟ اس پر قبیلہ والوں نے کہا کہ ہم راضی نہیں۔ ان کے اس جواب پر مہاجرین برہم ہونے لگے تو آپ ﷺ نے انہیں خاموش رہنے کا حکم دیا اور مال میں کچھ مقدار کا اضافہ کر کے قبیلہ والوں سے فرمایا کہ کیا اتنے کے بدلے تم راضی ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں ہم راضی ہیں۔ اس طرح یہ معاملہ ختم ہوا۔)"

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو جہم رضي الله عنہ کو اس مالی معاوضے کا ذمہ دار نہیں بنایا اور اپنی طرف سے رقم ادا فرمائی۔ اس لیے کہ صحابی رسول ﷺ اپنی ذات کے لیے کام نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ ریاست کی جانب سے والی مقرر کیے گئے تھے اور مسلمانوں کی مصلحت کے لیے کام کر رہے تھے۔ اسی طرح قاضی بھی مسلمانوں کی مصلحت عامہ کے لیے اپنے فرائض انجام دے رہا ہوتا ہے۔ اگر اس سے غلطی سرزد ہو جائے تو ریاستی ڈھانچے کی طرف سے اس کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔

گویا اسلامی ریاست اور جدید قومی ریاستوں کے قوانین دونوں اس پر متفق ہیں کہ جج کو وہ طمانیت اور آسودگی فراہم کی جائے جس کی اساس پر وہ اپنی ذمہ داریاں سکون سے ادا کر سکیں اور انہیں ذہنی استقرار مہیا ہو۔

فقہی ذخیرے کو سامنے رکھتے ہوئے ججوں کے تحفظ کے لیے جو امور ثابت ہوتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں[2]:

- جب تک قاضی جرم کا ارتکاب نہ کرے یا نص کی مخالفت نہ کرے اس سے کسی نقصان کے ازالے کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1] السجستانی،ابوداود،سنن ابوداود،باب العدل بين الناس، ح: 4534 ،صحیح

[2] ھانی رضا، العلاقات الدبلوماسیہ (قاھرہ ، دارالنہضہ،2014ء)38

- قاضی کا ہتک کے مقدمے سے تحفظ۔
- سربراہ ریاست کی جانب سے ججز کی معزولی سے تحفظ۔
- قاضی کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا جب تک ججز کے معاملات کی نگرانی کرنے والی مجلس عاملہ کی طرف سے اجازت نہ ہو۔
- جدید اجتہادی مسائل میں ججز کے حقِ اجتہاد کا تحفظ۔
- مکانِ عدل اور عدالتی احاطوں کا تحفظ۔

پاکستان میں عدالتی نظام اور استثناء کے قوانین:

عدالتی استثناء سے متعلقہ قوانین تمام ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ ریاستوں کے انتظامی اور سیاسی ڈھانچے کے اختلاف کی بنیاد پر ان کی تفصیلات و تشریحات میں کچھ فرق موجود ہیں۔ مثال کے طور پہ جدید قومی جمہوری ریاستوں میں ججز اور سربراہان ریاست کے لیے بنائے گئے قوانین ہلکی پھلکی تبدیلی کے باوصف تقریباً ایک جیسے ہیں۔ جبکہ وہ ممالک جن میں بادشاہی نظام رائج ہے وہاں سربراہان ریاست کے لیے زیادہ وسیع وامتیازی قوانین لاگو ہیں جن کی وجہ سے سربراہان ریاست کو عدالتی حوالوں سے تقریباً مکمل چھوٹ حاصل ہے۔ البتہ اسلامی ریاست کے لیے ترتیب دیے گئے فقہی قوانین میں عدالتی استثناء کا مسئلہ بہت حد تک مختلف ہے۔

عدالتی استثناء کا قانون صرف پاکستانی آئین کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی یہ قانون موجود ہے، اگرچہ تشریحات اور حدود وقیود کا فرق پایا جاتا ہے کہ ججوں کو دیے گئے استثناء کے قواعد کیا ہیں، کیا ان کا تعلق صرف عدالتی فیصلہ جات سے ہو گا یا پھر ان کے ساتھ امور بھی شامل ہوں گے۔ یعنی کہ ججوں کو ہتک، نقصان کے ازالے اور مقدمات سے جو براءت حاصل ہے وہ ان کے عدالتی فیصلہ جات سے متعلق ہوں گے یا پھر عدالتوں کے انتظامی معاملات میں ججوں کے عمل دخل اور احکامات کے حوالے سے بھی ان سے کوئی پرسش نہیں کی جاسکتی۔

پاکستان میں ججوں کو دیے گئے عدالتی استثناء کا تعلق عدالتی فیصلہ جات اور انتظامی امور دونوں سے ہے۔ ججز عوام کے مسائل میں جو فیصلے سناتے ہیں ان کے متعلق ان سے بازپرس نہیں کی جاسکتی، متاثرہ فریق ان کے خلاف دعوی دائر نہیں کر سکتا، فیصلہ غلط ہونے کی صورت میں بھی ان سے نقصان کے ازالے کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ہتک عزت کا دعوی دائر کیا جاسکتا ہے۔ عدالتی استثناء کا یہ قانون پاکستان کے آئین کی شق (5)199 میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ قانون نو آبادیاتی (Colonical period) عہد کے دوران انگریزوں نے 1857ء میں متعارف کرایا تھا جو ہلکی پھلکی ترمیم کے ساتھ ابھی تک پاکستان کے آئین کا حصہ ہے۔

اس دفعہ کا متن درج ذیل ہے:

No judge, magistrate, justice of the peace, collector or other person acting judicially shall be liable to be sued in any civil court for any act done or ordered to be done by him in the discharge of his judicial duty, whether or not within the limits of his jurisdiction : Provided that he at the time, in good faith, believed d himself to have jurisdiction to do or order the act complained of ; and no officer of any court or other person, bound to execute the lawful warrants or orders of any such judge, magistrate, Justice of the peace, collector or other person acting judicially shall be liable to be sued in any civil court, for the execution of any warrant or order, which he would be bound to execute, if within the juris diction of the person issuing the same.1

(کوئی جج، مجسٹریٹ، کلیکٹر یا کوئی بھی ایسا فرد جو رعدالتی سطح پر بطور نمائندہ اپنی خدمات انجام دے رہا ہے، اس پر اپنے کسی فیصلے کی وجہ سے مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہا ہے، کیونکہ جس وقت اس نے یہ کاروائی سنائی یا فیصلہ کیا وہ اچھی نیت رکھتا تھا۔ لہذا ایسا کوئی فرد جو جج ہو، مجسٹریٹ ہو کولیکٹر ہو یا پھر اس طرح کا عدالتی ذمہ داری ادا کرنے والا شخص اس کی گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری نہیں کیے جاسکتے نہ سول عدالت میں اسے پیش ہونے کا حکم دیا جاسکتا ہے۔)

شرعی اور مروج وضعی قوانین کی تفصیلات کا جائزہ لیا جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ عدالتی استثناء کی متعدد اقسام اور جہات ہیں۔ مثال کے طور پہ:[2]

- سربراہانِ ریاست سے متعلقہ عدالتی استثناء جس کی ایک نوع داخلی ہے، جبکہ دوسری قسم میں سربراہانِ ریاست کے لیے بنائے گئے عدالتی استثناء کے عالمی قوانین ہیں۔
- سفراء سے متعلقہ عدالتی استثناء۔
- ججوں سے متعلقہ عدالتی استثناء۔
- بین الاقوامی تنظیموں سے متعلقہ عدالتی استثناء۔

[1] PakistanConstitution,https://na.gov.pk/downloads.pdf,1-2-2022

[2] هانی رضا، العلاقات الدبلوماسیہ،99

بین الاقوامی قوانین میں سربراہانِ ریاست، سفراء اور عالمی تنظیموں کے مندوبوں کے لیے جو امتیازات وعدالتی استثناء کا ڈھانچہ ترتیب دیا گیا ہے اس میں درج ذیل شقیں شامل ہیں جن کا ہر ملک کو خیال رکھنا ہوتا ہے:[1]

- ان شخصیات کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔
- ان کی رہائش گاہوں کو مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا۔
- انہیں تفتیش کے لیے یا کسٹم کی جگہوں پر نہیں روکا جائے گا۔
- ان کے سامان کو نہیں کھولا جائے نہ انہیں چیکنگ کے عمل سے گزارا جائے گا۔
- انہیں ٹیکس کی ادائیگی سے چھوٹ دی جائے گی۔

عدالتی استثناء کی ان شقوں میں سے شریعت اسلامی سب کی حمایت و تائید نہیں کرتی، کیونکہ اس کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں۔ البتہ ان کے تحفظ کی غرض سے کچھ اقدامات اٹھائے جاتے ہیں اور ان کو کچھ پروٹوکولز دیے جاتے ہیں جو انہیں ایک گونہ عہدے کا احترام عطا کرتے ہیں۔

وضعی قوانین میں جو عدالتی استثناء اور امتیازات قضاۃ کو فراہم کیے گئے ہیں ان میں بھی اسلامی شریعت کو برتری حاصل ہے۔ وضعی قوانین میں قضاۃ کو جو استثناءات مہیا کیے گئے ہیں یہ ابھی کے ہیں، جبکہ دین اسلام نے قضاۃ کی حصانت کے لیے کئی صدیاں قبل اقدامات اٹھائے تھے۔ اسلامی شریعت کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ ججوں کو زیادہ وسیع مجال عطا کرتی ہے۔ وضعی قوانین میں ججوں کو مخصوص قوانین و دائرے کا پابند رہنا ہوتا ہے جبکہ اسلام میں قضاۃ کو اجتہاد کی وسعت عطا کی گئی ہے کہ وہ زیادہ آزادانہ طریقے سے فیصلے کر سکتے ہیں، جب تک کہ وہ صراحتاً شریعت کی مخالفت نہ کریں۔

کسی شخص پر ریاستی قانون کے اطلاق کے متعلق بین الاقوامی قانون نے عام طور پر دو اصول تسلیم کیے ہیں: ایک علاقائیت (Territoriality) کا اور دوسرا قومیت (Nationality) کا۔ پہلے اصول کی رو سے یہ طے پایا ہے کہ جو شخص بھی کسی ریاست کی علاقائی حدود میں پایا جاتا ہے، اس پر اس ریاست کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ دوسرے اصول کی رو سے مانا گیا ہے کہ کسی ریاست کے شہری پر اس کی اپنی ریاست کے قانون کا اطلاق ہر جگہ ہوتا ہے خواہ وہ اپنی ریاست کی علاقائی حدود کے باہر ہو۔ اب اگر ریاست الف نے ریاست ب کی طرف اپنا سفیر بھیجا ہے تو وہ ریاست

[1] محمد سلمان، القانون الدولی العام (قاهره، الهيئة المصرية للكتاب، 2019ء) 148

الف کا شہری ہے اور ریاست ب کی علاقائی حدود میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قومیت کے اصول کی رو سے اس پر ریاست الف کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے اور وہ جو فعل بھی کرے اس کے لیے وہ اپنی ریاست کی عدالتوں کے سامنے جواب دہ ہو گا لیکن ریاست کی علاقائی حدود میں موجودگی کے باوجود اس پر ریاست کے قانون کے اطلاق نہیں ہوتا، نہ ہی وہ ریاست کی عدالتوں کے سامنے جوابدہ ہے۔ اسے اختیار سماعت سے استثناء(Immunity from jurisdiction) کہا جاتا ہے[1]۔

بین الاقوامی قانون میں یہ استثناء عام طور پر دو اشخاص کے لیے تسلیم کیا گیا ہے: سربراہِ ریاست اور سفیر۔ ان دونوں کو یہ استثنا کیوں حاصل ہے؟ اس کی تفصیل میں جائیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بین الاقوامی قانون نے ریاست کو حاکمیت اعلیٰ یا خود مختاری(Sovereignty) کا حامل مانا ہے اور اس تصور کے لازمی نتیجے کے طور پر یہ بھی مانا ہے کہ حاکمیت اعلیٰ کا حامل کسی کو جواب دہ نہیں ہوتا۔ چونکہ ریاست کے سربراہ اور سفیر کو اس حاکمیت اعلیٰ کا ترجمان یا نمائندہ سمجھا جاتا ہے، اس لیے اس پر دوسری ریاست کے قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے ریاستی قانون کی رو سے وہ اپنی ریاست کی عدالتوں کے سامنے جواب دہ ہو۔

اسلامی قانون کی رو سے سفیر کو تحفظ اس امان کی رو سے حاصل ہوتا ہے جو مسلمانوں میں سے کوئی شخص اسے عطا کرتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر، سفیر کی قانونی حیثیت "مستامن" کی ہے۔

اسلامی قانون سفیروں کو قانون کے اطلاق سے استثناء نہیں دیتا بلکہ مسلمانوں پر انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ جس شخص یا اشخاص کو انھوں نے امان دی ہے اس کے جان و مال اور دوسرے حقوق کی حفاظت کریں۔ یہ امان دو طرفہ معاہدہ ہوتا ہے اور اس کی رو سے دوسرے فریق پر یہ بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسا اقدام نہ کرے جو امان کے خلاف ہو۔ چنانچہ اگر "مستامن" نے امان لینے کے بعد امان کی خلاف ورزی کی تو اس کے خلاف کارروائی کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:

- اگر اس نے کسی شخص پر حملہ کیا تو اس شخص کو دفاع کا حق حاصل ہے اور دفاع کا یہ حق انھی قیود و حدود میں استعمال کیا جا سکتا ہے جن قیود و حدود میں کسی بھی دوسرے شخص کے حملے کے خلاف اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

[1] محمد سلمان، القانون الدولی العام، 148

- اس کے خلاف مقدمہ چلا کر اسے عدالت سے سزا بھی دلوائی جاسکتی ہے، سوائے حدود اور قصاص کی سزاؤں کے، کیونکہ مستامن پر ان سزاؤں کا نفاذ نہیں کیا جاسکتا جنھیں اسلامی قانون کی رو سے "حق اللہ" کہا جاتا ہے۔ البتہ قتل کی صورت میں دیت اور زخموں کے لیے ارش، یا اگر صلح ہو جائے تو بدلِ صلح اس سے وصول کی جاسکتی ہے۔
- اگر اس نے "جاسوسی" کی تو اس کے خلاف اقدام کا حق حکمران کو حاصل ہے جو مناسب سمجھے تو اسے اس کے جرم کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے مناسب سزا دے سکتا ہے، اور بعض سنگین صورتوں میں یہ سزائے موت بھی ہو سکتی ہے

۔

- اگر وہ "جنگی اقدام" کرے، مسلح جتھوں کی تربیت کرے، ان تک اسلحہ پہنچائے، ان کی معاونت کرے، یا خود جنگی کارروائی میں حصہ لے، تو یہ سب امور امان کے خاتمے کا باعث بنتے ہیں اور ان صورتوں میں حکمران اس کے خلاف ہر وہ کارروائی کر سکتا ہے جو کسی بھی دوسرے مقاتل کے خلاف کی جاتی ہے۔

یہ سب کچھ اس صورت میں ہوتا ہے جب مسلمانوں نے اس ضمن میں دوسرے فریق کے ساتھ کوئی خصوصی معاہدہ نہ کیا ہو بلکہ صرف امان ہی دی گئی ہو۔ اگر دوسرے فریق کے ساتھ انفرادی طور پر یا اس کی قوم کے ساتھ اجتماعی طور پر کوئی معاہدہ کیا گیا ہو تو پھر اس معاہدے کو بھی مد نظر رکھا جائے گا۔

عدالتی استثناء قانونی استثناء کی قسم ہے۔ عدالتی استثناء کی اصطلاح کا عمومی اطلاق ججوں کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے۔ یہ تحفظ مالی و جسمانی نقصانات کے ازالے سے ہے اور اسی طرح فیصلوں سے متعلقہ مقدمات میں ان کی پرسش یا گرفتاری سے متعلق ہوتے ہیں۔ جج جب لوگوں کے مقدمات میں فیصلے کرتے ہیں تو ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس عمل کے دوران کسی کے دباؤ میں نہیں آئیں گے اور بہر صورت انصاف کی فراہمی کو یقینی بنائیں گے۔ جج اس فریضے کی ادائیگی کے لیے ریاست کی جانب سے مقرر کیے جاتے ہیں اور ان کے تمام فیصلے ریاست کی جانب سے محفوظ و حمایت یافتہ ہوتے ہیں۔ البتہ اگر ججوں کے بارے میں کوئی عمداً ناانصافی کا شبہ ہو یا شاہد موجود ہو تو انہیں برطرف کیا جاسکتا ہے اور انہیں سزا دی جاسکتی ہے۔
یہ مروج وضعی قانون ہے جس کی بنیاد یورپ میں رکھی گئی تھی۔

It originated in courts of primitive Europe to discourage persons from attacking a court decision by suing judge.[1]

(اس قانون کی بنیاد یورپ میں رکھی گئی تھی تاکہ لوگوں کو اس بات سے روکا جاسکے کہ وہ ججوں پر ان کے فیصلوں کی اساس پہ حملہ کریں یا ان کے خلاف کوئی اقدام کریں)۔

عدالتی استثناء کے قانون کے مجاز ہونے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جج ریاست اور سربراہِ ریاست کے نمائندے ہوتے ہیں اس لیے ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا جاسکتا:

"In judicial immunity, the prosecutor who is acting under the direction of sovereign cannot be held liable for acts done as an agent of sovereign.[2]"

(عدالتی استثناء کے قانون کے تحت وہ شخص جو ریاستی نمائندگی میں اپنی خدمات پیش کر رہا ہے اس پر مقدمہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی بطور ریاستی نمائندے کے اس پر کوئی فرد جرم عائد کی جاسکتی ہے۔)

قانونی استثناء کی اصطلاح اپنی اصل میں سربراہانِ ریاست اور ان کے نمائندگان کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یا پھر ان انفرادی معاملات میں بھی کہ جن میں ریاست کی جانب سے کسی فرد یا اثاثے کو مخصوص امتیازات کا حامل بناتے ہوئے انہیں کچھ تحفظ دیا جاتا ہے۔ یہ تحفظ مقدمات، نقصان کے ازالے یا گرفتاری سے ہوتا ہے۔

اگرچہ اس پر عدالتی استثناء کا اطلاق بھی ہوتا ہے لیکن ان دونوں کے مابین فرق جزوی فرق موجود ہے جسے عام طور پہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔

"Legal immunity means law provides immunity to individual or entity. Legal immunity is basically a legal position wherein an individual or entity cannot be held liable for violation of law in order to facilitate societal aims.[3]"

(قانونی استثناء سے مراد یہ ہے کہ کسی فرد یا اثاثے کو تحفظ یا امتیازی حیثیت فراہم کی جائے۔ قانونی استثناء اصل میں لیگل پوزیشن ہے جس کے تحت مصلحت عامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی فرد یا اثاثے کو نقصان کے ازالے یا اس نقصان کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا)۔

---

[1] D Thompson, Judicial Immunity and Protection of Judges, (1958),https://onlinelibrary.wiley.com/doi/pdf/10.1111/j.1468-2230.1958.tb00491.x (Accessed on: July. 19, 2021)

[2] D Thompson, Judicial Immunity and Protection of Judges, (1958),

[3] A.T.H Smith, Immunity from Prosecution, Vol. 42, Pg. 299-327 (November, 1983), https://www.jstor.org/stable/4506559 (Accessed on: July. 20, 2021)

قانونی استثناء کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی سنگین جرم کے مقدمے میں پراسیکیوٹر کسی عینی شاہد کے بعض ہلکے جرائم و مقدمات کو ختم کر کے اسے تحفظ دیدے۔ اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ پراسیکیوٹر ایک ایسے شخص کے جرم و مقدمات کو نظر انداز کر کے اسے ختم کر دے جو منشیات کے چھوٹے کاروبار ملوث پایا گیا ہے لیکن اس کے بدلے میں وہ منشیات کے بڑے گروہ کو عدالت کے کٹہرے میں لانے میں مدد دے۔

قانونی تحفظ کی اصطلاح کا استعمال ان افراد کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے بھی ہوتا ہے جو معاشرے میں امن کے فروغ کے لیے اقدامات کرتے ہیں لیکن انہیں خطرات لاحق ہوتے ہیں، ایسے میں ریاست ان افراد کو استثناء اور تحفظ فراہم کرتی ہے اس کو بھی قانونی استثناء تعبیر کیا جاتا ہے۔

عدالتی استثناء کی صورت ججوں کے معالات سے متعلق ہوتی ہے جبکہ قانونی استثناء میں وسعت ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات سے پتہ چلتا ہے کو عدالتی استثناء اور قانونی استثناء کے مابین کچھ فرق موجود ہے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

عدالتی استثناء	قانونی استثناء
عدالتی استثناء قانونی استثناء کی ایک قسم ہے۔	قانونی استثناء زیادہ وسیع مفہوم کا حامل ہے۔
عدالتی استثناء کا تعلق ججوں کے معاملات سے ہوتا ہے۔	قانونی استثناء میں انفرادی نوع کے متنوع معاملات شامل ہوسکتے ہیں جن میں سربراہان ریاست کا تحفظ بھی شامل ہے اور نچلے درجے میں افراد کا مخصوص تحفظ بھی۔
عدالتی استثناء میں جو تحفظ حاصل ہوتا ہے وہ کسی فیصلے یا بیان کے نتیجے میں ہوتا ہے۔	قانونی استثناء میں کسی فعل اور عمل کے ذیل میں تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

فصل دوم:

عدالتی استثناء کے قوانین کا ارتقاء

تخلیق آدم علیہ السلام کے ساتھ ہی نیابت کے استعارے کے ساتھ جہاں بہت ساری دیگر صفات واختیارات سپرد نسل آدم ہوئیں وہیں احتساب کا فرض معین بھی ذمہ داران بنی نوع انسان کو تفویض کیا گیا۔ اپنا احتساب، اپنے بال بچوں کا احتساب، خاندان معاشرہ اور تہذیب و تمدن کا احتساب اس عمل کے وہ دائرہ ہائے کار ہیں جن سے کوئی فرد مبرا نہیں۔ یہ کتنا اہم فریضہ ہے، اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ تخلیق کے فوراً بعد اولین انسان نے حاکم کائنات کے جن جن شعار اقتدار کا مشاہدہ کیا ان میں احتساب سرفہرست تھا، امر خداوندی سے انکار پر فوری احتساب۔ گویا عدل اور احتساب کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ حضرت انسان خود۔

لیکن عدل واحتساب کے تصور کے قدیم ہونے کے باوجود یہ واضح ہے کہ حکمرانوں اور عوام کے مابین عدل واحتساب کے تصور کا فرق موجود رہا ہے۔ حکمران عام طور پہ احتساب کے عمل سے محفوظ رہے ہیں۔ بلکہ بادشاہ ہی عدل کا دوسرا نام سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے حکمرانوں کی سطح پر ایک غیر دستاویزی نوع کا سمجھوتہ موجود رہا کہ حکمران کو استثناء حاصل ہوتا ہے اور اس کے فیصلوں کو چیلنج بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ ججز کے استثناء کا معاملہ قومی ریاست کے وجود کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ اس لیے ججز کے تناظر میں عدالتی استثناء کے حوالے سے تاریخی حوالے نہ ہونے کے برابر ہیں۔

قدیم تہذیبوں میں عدالتی استثناء کا سلطانی تصور موجود رہا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ ہی فیصل ہے اور اس کے صادر کیے ہوئے احکامات حتمی گردانے جائیں گے۔ اس ضمن میں عدلیہ اور اس کے تمام معاملات بھی شامل تھے۔ کیونکہ ابتداء میں تمام طاقتیں فرد واحد کی ذات میں منحصر ہوتی تھیں۔

"Basicto an understanding of sacred kingship is a recognition that the exercise of power of one person over other persons or over ،a community in early times was general and not divided. Power could be exercised by only one personone who simultaneously had the necessary physical, judicial and spiritual strength and influenceover both people and objects. Because he was ruler over a community, the

king's power extended to everything pertaining to the life of the community. Only gradually did a division of these powers develop.[1]"

(مقدس بادشاہت کے تصور کو سمجھنے کی بنیاد اس بات پر قائم ہے کہ قدیم زمانوں میں طاقت کی تقسیم نہیں ہوتی تھی، اور فرد واحد ہی لوگوں اور معاشروں پر اصل حاکم ہوتا تھا۔ طاقت کا منبع صرف بادشاہ کہلاتا تھا جو بیک وقت جسمانی، عدالتی اور روحانی طور پہ اثر انداز ہو سکتا تھا، لوگوں پر بھی اور چیزوں پر بھی۔ کیونکہ وہ مطلق حاکم متصور ہوتا، بادشاہ کے اختیارات سماج میں لامحدود ہوتے تھے۔ بعد میں جا کے رفتہ رفتہ طاقت کی تقسیم کا عمل شروع ہوا۔)

کلاس ویسٹرمین (Claus Westermann) اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"From earliest times, in addition to other functions, the chief was the judge of his tribe;He personified the protection that the community provided for the individual. Providing for a balance of power in the community, mediating quarrels, and protecting individual rights, the chief or king was the lawgiver and the highest administrator for all community affairs. The ensi, the lawgiver and the highest judicial authority in the Sumerian city-state, was responsible for order. In Egypt the king was the highest judge, the guarantor of all public order, the lord over life and death.[2]"

(پہلے زمانوں میں دیگر اختیارات و طاقتوں کے ساتھ جو ایک اور اختیار قبیلے کے سربراہ کے پاس ہوتا تھا وہ عدلیہ و قضاء کا تھا، اس کی ذمہ داری تھی کہ کہ سماج جو حقوق فرد کو عطا کرتا ہے اس کا تحفظ کرے اور سماج میں طاقت کے توازن کو برقرار رکھے۔ قبیلے کا سربراہ قانون سازی کرتا کمیونٹی کے تمام معاملات کی نگہبانی کا فریضہ انجام دیتا۔ سامرائی تہذیب میں زمینوں کا مالک، قانون بنانے والا اور انتظامی امور کا رکھوالا ہی حقیقی طاقت کا مالک تھا۔ مصر کی قدیم تہذیب میں بادشاہ سب سے بڑا قاضی کہلاتا، وہی لوگوں میں سیاسی سماجی زندگی کو متوازن رکھتا اور زمین پر زندگی موت کا خدا کہلاتا۔)

مؤرخین کے مطابق بابلی تہذیب میں ابتداء کے اندر مذہبی طبقہ قضاء کے معاملات کا ذمہ دار تھا لیکن وقت کے ساتھ ان لوگوں نے کرپشن اور بے ایمانی شروع کر دی تو اس سے سماج میں فساد پھیلنے لگا۔ یہ طبقہ اتنا طاقتور اور مالدار ہو گیا تھا کہ ان کی گرفت کرنا آسان نہ رہا۔ بعد میں جب حمورابی بادشاہ بنا تو اس نے عدلیہ کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے

[1]Jitsi,H.F, Prince, Pen and Sword. Eurasian Perspective (London, Oxford Press, 2010) p:144
[2]Claus Westermann, sacred kingship religious and political concept, https://www.britannica.com/topic/sacred-kingship/Functions-of-the-sacred-king-the-king-as-the-source-of-cosmic-power-order-and-control,31-2-2021

لیے۔ حمورابی کے عہد میں انصاف کا بول بالا ہوا اور طبقاتی تقسیم ختم ہوئی۔ بادشاہ خود اگرچہ کسی قانون گرفت سے بالا تھا لیکن اس کے دور میں عوامی سطح پر انصاف دیکھا گیا۔ اس کی اپنی کتاب ''قانونِ حمورابی'' میں اپنے عہد کی توصیف میں لکھا گیا ہے کہ:

"ملك العدالة وأنه أقام في الأرض شريعة عادلة حتى لا يظلم الأقوياء الضعفاء،وحتى ينال العدالة اليتيم والأرملة"۔[1]

(وہ عدل کا بادشاہ تھا، زمین پر اس نے انصاف کا نظام قائم کیا تا کہ طاقتور لوگ کمزوروں پر ظلم نہ کر سکیں، اور تا کہ یتیم اور بیوہ کو بھی انصاف ملے۔)

قدیم مصری تہذیب میں بھی فراعنہ قضاء کے منصب پر فائز تھے۔ وہ خود کو خدا کہلواتے تھے اس لیے وہ ہر قسم کے عدالتی استثناء کے حامل بھی تھے۔ دوسرے علاقوں میں فراعنہ کے مقرر کردہ کارندے گورنر ہوتے اور وہ فرعون کے نائب کے طور پہ قضاء کے فرائض بھی انجام دیتے۔ لہذا وہ نائبین بھی مستثنیٰ ہوتے تھے لیکن فرعون کے آگے وہ جوابدہ تھے۔

"أن القضاة في ذلك العصر في الأقاليم كانوا يعينون من قبل الفرعون نفسه وبالتالي فهم يتمتعون بالحصانة بجميع أنواعها،إلا أنها حصانة في مواجهة الأفراد فقط،دون الفرعون۔"[2]

(فراعنہ کے دور میں دیگر علاقوں میں قضاء کے لیے لوگ فرعون کی طرف سے منتخب کیے جاتے تھے۔ لہذا وہ بھی عدالتی تحفظ کے حامل تھے، لیکن صرف عوامی سطح پر، فرعون کے آگے نہیں۔)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمیری تہذیب اور دوسری قدیم تہذیبوں میں عدالتی استثناء کا تصور اگرچہ ذرا مختلف تھا کہ یہ بادشاہ اور اس کے نمائندوں کے لیے ہوتا تھا لیکن اس کی وجہ بادشاہ کا مقدس ہونے کا تصور تھا۔ بادشاہ ان کے خداوں کی طرف سے تحفہ ہے اور وہ خدا کی طرف سے خاص طور پر چنا گیا ہے۔ اس لیے وہ ہر کسی کام سے استثناء ہوتا ہے۔

[1] منذر الفضل،تاريخ القانون (بيروت، دارانماء،1998ء) 81

[2] عطيه مشرف، القضاء فى الاسلام (قاهره، دارالصدوق، 2004ء)112

اگر ہم موجودہ کتب مقدسہ تورات اور بائبل کا مطالعہ کریں تو ہمیں ان میں بھی استثناء کا قانون ملتا ہے جو یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے خود ساختہ قانون کے ذریعہ بادشاہوں اور ججوں کو دیا ہوا ہے۔

"Every Jewish community must have a judge .He must rule fair and take no bad money-In Torah :The judge is always right even if the opinion is wrong.[1]"

(ہر یہودی برادری کا ایک جج ہونا چاہیے۔ اسے منصفانہ حکومت کرنی چاہئے اور کوئی برا پیسہ نہیں لینا چاہئے۔

تورات میں: جج ہمیشہ درست ہوتا ہے چاہے رائے غلط ہو۔)

"God says about the Kings:The Kings heart is the hand of the Lord, like the water of the river. He may wish whatever he likes[2]".

(بادشاہوں کے بارے میں خدا فرماتا ہے: بادشاہوں کا دل رب کا ہاتھ ہے، دریا کے پانی کی طرح۔ وہ جو چاہے کریں۔)

ہندومت قدیم ترین مذاہب میں سے ہے جس میں اواگان اور جونی چکر دراصل تصور احتساب ہی کی باقیات ہیں لیکن انکا تعلق آئندہ جنم سے استوار کر دیا گیا ہے۔ زندہ معاشرے میں ہندوؤں کے عمل احتساب کا اندازہ منودھرم کی شاستر کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے "اگر شودر کسی غیر شادی شدہ سے زنا کرے تو اسکا وہ عضو کاٹ دیا جائے جس سے اس نے زنا کیا ہے اور تمام جائداد ضبط کر لی جائے اور اگر عورت شادی شدہ ہو تو شودر کو قتل کر دیا جائے اور اگر برہمن کسی شادی شدہ عورت سے زنا کرے تو 500 پن جرمانہ کر دیا جائے۔ ایک کشتری کو قتل کرنے کا جرمانہ اس سے چوتھائی ہے جو برہمن کو قتل کرنے کا ہے ویش کو قتل کرنے کا جرمانہ اس آٹھواں حصہ ہے اور شودر اگر نیک ہو تو اسکو قتل کرنے کا جرمانہ سولھواں حصہ ہے[3]۔

اس طرح کے بے شمار قوانین اور عزو شرف کے استحقاق کو نسل پر بنیاد کرنے والے معاشرے نے احتساب ہی نہیں عدل و انصاف و مساوات اور بنیادی انسانی حقوق کا ہی گلہ کاٹ کر رکھ دیا ہے۔

[1]https://www.aish.com/tp/b/lp/48952216.html
[2]https://en.wikipedia.org/wiki/Christian_views_on_the_Old_Covenant
[3]بحوالہ، مودودی، ابوالاعلی، سید، الجہاد فی الاسلام (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، 1996ء) 371

بدھ مت قدیم ترین مذاہب میں سے ایک ہے۔اسکے بقا کی واحد وجہ یہی ہے کہ بدھ مت کسی ظالم فرمانروا کے احتساب سے عاری رہا بلکہ "چین کے شاہ منگ ٹی اور تبت کے قبلائی خان جیسے بادشاہوں نے بدھ مت کے مبلغین کو خوش آمدید کہا اسکی وجہ یہی ہے اس مذہب نے ظلم کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی کبھی جرات نہیں کی۔انسانوں کو سرکش حکمرانوں سے نجات دلاناتو کیا کبھی اسکا خیال تک نہیں کیا"[1]۔

ابتدائی زمانہ میں جب انسان کی طرزِ معاشرت وحشیانہ تھی اور منظم ومنضبط حکومتوں کا قیام نہیں ہوا تھا، ستم رسیدہ اور متضرر اشخاص اپنا انتقام آپ لیا کرتے تھے اور اگر ایک شخص کی دوسرا شخص حق تلفی کرتا تو وہ اپنے حق کو بچانے کے لیے جنگ وجدل اور دھینگا مشتی سے اپنی مدد آپ کرتا تھا۔ بعض اوقات اس کے قرابت دار اور احباب بھی اس کے دشمنوں سے انتقام لینے میں اس کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ایک زمانے میں مظلوم اپنی مدد آپ کر سکتا تھا، پھر وہ دور آیا کہ اس حق پر کچھ پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ پھر زمانہ بدلا اور حق لینے کے لیے صاحبِ رسوخ کی زیر نگرانی لڑنے کا رواج متعارف ہوا۔ پھر وہ وقت آیا کہ تنازعات کو ثالثوں اور پنچائتوں کے سپرد کرنے کا رواج چل نکلا۔ لیکن جب سلطنتیں مضبوط اور مستحکم ہو گئیں تو اُنہوں نے باقاعدہ عدالتیں قائم کر دیں جو انصاف کرنے کے معاملے میں فرمانروا کی نمائندہ قرار دی گئیں اور اس طرح نظامِ معدلت وجود میں آگیا۔ تاریخ کے مطالعے سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ نظامِ عدل کا قیام حکومتوں اور سلطنتوں کی مضبوط مستحکم قوت کی بناپر معرضِ وجود میں آیا۔ نظامِ معدلت کو قائم کرنے کے لیے ایک مضبوط اور پائیدار حکومت کا ہونا ضروری ہے[2]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدل کا باضابطہ نظام آہستہ آہستہ معاشروں میں ترقی حاصل کرتا رہا۔ جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں انسان اپنے نزاع کا تصفیہ ذاتی طاقت اور قوت کے استعمال سے کرتا تھا۔ اور ذاتی انتقامی کاروائی انصاف کے خلاف استعمال ہوتی تھی۔

یورپ میں عدالتی استثناء اور اختیارات:

مغربی تہذیب میں ججوں کے تحفظ اور امتیازات سے متعلقہ قواعد وضوابط سترھویں اٹھاویں صدی کے بعد کا اضافہ ہیں جبکہ مسلمانوں کے ہاں استقلال قضاء کی بنیاد کئی صدیاں پہلے قرآن وسنت کی ہدایات اور خلفاء راشدین کی نظیروں کی

---

[1] مودودی، ابولاعلی، سید، الجہاد فی الاسلام، 405

[2] عائشہ راتب، التنظیم الدستوری (قاھرہ، دارالنہضہ، 1990ء)، 47-52

روشنی میں اس طرح مستحکم ہوگئی تھی کہ اسلامی نظام قضاء بڑے بڑے جابرانہ حکمرانوں کے دور میں بھی عدل وانصاف کی فراہمی کے بنیادی فریضہ کی ادائیگی میں کامیاب رہا۔ ججوں کا تحفظ، استقلال اور عدلیہ سے متعلقہ ان کے حقوق اور ان کے کیے گئے فیصلوں اور ان کی ذات کا تحفظ اسلامی تہذیب کی اساس بن کر سامنے آئی۔ مسلمان فقہاء نے ادب القاضی کے عظیم ذخیرے میں ایسے بیش قیمت موتی چھوڑے ہیں جو آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی عدلیہ کی آزادی کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔ اسلامی نظام قضاء ایک طرف ججوں کے استقلال حریت کا تحفظ کرتا ہے تو دوسری طرف ان کے کردار، رویے اور شخصیت کے رجحانات کو بھی منظم کرتا ہے۔ تاکہ وہ نہ صرف بلاخوف خطر فیصلے کریں بلکہ ان کی شخصیت کی طرف بھی کسی کو طعن کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکے۔

رومن لاء میں ججوں کے فیصلے کے خلاف لوگوں کو اپیل کا حق حاصل تھا۔ یہ اپیل عموماً اسی اتھارٹی کے پاس کی جاتی تھی جس کو جج کے تقرر کا اختیار حاصل تھا۔ جج کے غلط فیصلوں کی صورت میں (Justanian Law) جسٹینین لاء کے مطابق جج کو کوئی خاص تحفظ حاصل نہیں تھا۔ ججوں کے خلاف دعوے دائر کیے جاسکتے تھے۔ ان کی بعض غلطیوں کے سبب ان کے خلاف تادیبی کاروائی کی جاسکتی تھی۔ جدید عدالتی استثناء کا رومن لاء (Roman law)

"{The legal system of the ancient Romans that includes written and unwritten law, is based on the traditional law and the legislation of the city of Rome, and in form comprises legislation of the assemblies, resolves of the senate, enactments of the emperors, edicts of the praetors, writings of the jurisconsults, and the codes of the later emperors-"

(قدیم رومیوں کا قانونی نظام جس میں تحریری اور غیر تحریری قانون شامل ہے، روایتی قانون اور شہر روم کی قانون سازی پر مبنی ہے، اور اس کی شکل میں اسمبلیوں کی قانون سازی، سینیٹ کے حل، شہنشاہوں کے نفاذ، قانون سازی پر مشتمل ہے۔ پیروکار، فقہی مشاہیر کی تحریریں، اور بعد کے شہنشاہوں کے ضابطے۔})

اور سیلٹک لاء (Celtic law)

{Celtic law is thus a stateless form of law like most customary law forms. The professional jurists were consulted by parties to disputes for advice as to what the law was in particular cases, and these same men often acted as arbitrators between suitors. They remained at all times private persons, not public officials; their functioning depended upon their knowledge of the law and the integrity of their judicial reputations.

اس طرح سیلٹک قانون سب سے زیادہ روایتی قانون کی شکلوں کی طرح قانون کی ایک بے ریاست شکل ہے۔ پیشہ ور فقہا سے فریقین کی طرف سے تنازعات کے لیے مشورہ کیا جاتا تھا کہ خاص معاملات میں قانون کیا ہے، اور یہی لوگ

اکثر فریقین کے درمیان ثالث کے طور پر کام کرتے تھے۔ وہ ہر وقت نجی افراد رہے، سرکاری اہلکار نہیں۔ قانون کے بارے میں ان کے علم اور ان کی عدالتی ساکھ کی سالمیت پر منحصر ہے۔}

میں کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ دسویں صدی عیسویں میں شاہی حکم ناموں میں غلط فیصلوں پر ججوں کی ذمہ داری موجود ہوتی تھی۔ جسٹینین لاء کے تحت 534ء میں ایسے کئی قوانین متعارف کرائے گئے جن کی رُو سے قدیم رومی قوانین میں تبدیلیاں کی گئی تھیں، بالخصوص مقدمات کے لیے طریق کار میں اصلاحات مشہور ہوئیں۔ اس میں مقدمات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے حصے میں عدالت مسئلے میں بحث کے لیے کیس تیار کرتی۔ مقدمے کے دوسرے حصے میں یہ کیس عدالت میں پیش کیا جاتا۔ مجسٹریٹ شاہی افسر ہوتے تھے جن کے پاس عدالتی اختیارات کے ساتھ وسیع انتظامی اختیارات ہوتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ان کی جوابدہی کے لیے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی جاتی تھی۔ اگر کسی مقدمے کے فیصلے میں غلطی کا شبہ ہوتا تو مقدمے کے حصہ اول کا کیس تیار کرنے والی کمیٹی کے تعاون سے اس کیس میں نظر ثانی کی جاسکتی تھی اور ججوں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔[1]

تاریخ میں کئی ایسے شواہد موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محتسب کا ادارہ کسی نہ کسی شکل میں انسانی تہذیب کے ہر دور میں موجود رہا ہے۔

تیرھویں صدی میں انگلینڈ میں بادشاہ کے انصاف King's Justice کو ماتحت عدلیہ کی اصلاح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ کی عدالت کو تمام قسم کے ریکارڈ کی عدالت خیال کیا جاتا تھا اور وہ ماتحت جج جو شاہی عدالت میں ریکارڈ فراہم کرتے تھے ان کو ریکارڈ کی غلطیوں سے بری الذمہ قرار دیا گیا اور یہیں سے ججوں کے استثناء کے تصور کا آغاز ہوا۔

سترھویں صدی میں Courts to Record (ٹرائل کورٹس) کے ججوں کے استثناء کو مربوط انداز میں مدون کیا گیا اور عمومی طور پر اس صدی کے آخر میں یہ استثناء مزید مضبوط ہوا اور سول قانون کا حصہ بن گیا۔

چین کے منگول شہنشاہ قبلائی خان نے اس قسم کا ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا جسے سنسریٹ (Censorate) کہتے تھے۔ یہ محتسب کے اغراض و مقاصد کے بہت قریب تر تھا۔ اس کی نگرانی میں افسران اور اہلکاروں کی زیادتیوں کی جانچ پڑتال ہوتی اور عوامی شکایات کا ازالہ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح محتسب کی طرز کے اداروں کی تشکیل اور قیام کا پتہ رومن تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ لیکن عصر حاضر میں احتساب کے لیے قائم ہونے والے ادارے بہت حد تک انیسویں اور

[1] العتوم محمد شبلي،اتفاقيات الحصانة،(اردن،دار وائل للنشر والتوزيع، 2013ء)، 120تا111

بیسویں صدی میں قائم ہوئے۔ سویڈن میں یہ ادارہ 1809ء میں تشکیل پایا، برطانیہ میں 1927ء میں قائم ہوا۔ 1919ء میں فن لینڈ میں، 1954ء میں ڈنمارک میں، 1962ء میں ناروے میں اور 1970ء میں کینیڈا میں محتسب کے ادارے قائم کیے گئے۔ لیکن جدید مغربی مفکرین میں سے کچھ کے نزدیک سربراہ ریاست کا احتساب ممکن نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے کسی بھی فعل کی وجہ سے اس کو حکمرانی سے محروم کیا جاسکتا ہے۔ ان مفکرین میں ژین بودین(Jean Bodin) اور تھامس ہابز (Thomas Hobes) شامل ہیں۔ ان کے خیال میں جب اس کو ریاست کا سربراہ بنادیا گیا تو پھر اب یہ منصب اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ وہ اس دنیا میں خدا کا نمائندہ ہوتا ہے۔ خدا نے اس کو یہ منصب عطا کیا ہے۔ خدا کے علاوہ کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اسے اس منصب سے محروم کرسکے۔ تھامس ہابز نہ صرف ریاست کے سربراہ کو احتساب اور ردعمل سے بالاتر قرار دیتے ہیں بلکہ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ کسی کو بھی ریاست میں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ سربراہ ریاست کے ہوتے ہوئے اس کو عہدے سے دستبردار کرسکے۔[1]

برطانیہ کے اندر 1726ء میں شاہی فرامین کو عدالتی فیصلوں کی حیثیت حاصل تھی اور ان کے فرامین کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ برطانوی سماج میں اس مقولے کو شہرت حاصل تھی کہ The king can do norong (بادشاہ کوئی غلطی نہیں کرسکتا)، یعنی کہ شاہی تصرفات حتمی اور فیصلہ کن شمار ہوتے تھے۔[2]

اسلام میں استقلالِ قضاء کا تاریخی تصور:

اسلامی قانون میں استقلال قضاء کا آغاز عملی طور پہ صدر اسلام سے ہی ہوگیا تھا۔ قرآن وسنت میں عدلیہ کی اہمیت اور عدل کی فراہمی کے پیغمبرانہ فرائض کی اہمیت کی بنا پر خلفائے راشدین نے نہ صرف عدلیہ کو مضبوط کیا بلکہ اسے مکمل آزادی بھی دی۔ خلفائے راشدین عدالتوں میں پیش ہوتے تھے اور ججوں نے ان کے خلاف فیصلے بھی سنائے۔ عدلتوں اور قاضیوں سے متعلقہ خلفائے راشدین کے رویے کو بعد میں فقہ اسلامی کے دورِ تدوین میں قانونی نظائر کا درجہ

[1] ششتاوي سمير, المسؤولية الجنائية لضباط الشرطة عن قتل المتظاهرين (قاهره،الطبعة،الأولى، المكتب الجامعي الحديث2000ء) 98
(مصنف مصر کے علاقے رمسیس غزہ میں قانون دان اور وکیل ہیں۔)

[2] محمدی،حسن محمد ، الحصانة الجنائیہ (عمان، دارالثقافہ،2001ء)133

حاصل ہو گیا تھا اور قرآن و سنت کے احکام و خلفائے راشدین کے تعامل کی بنا پر فقہاء نے دور تدوین میں مدون کیے گئے۔

اسلامی ریاست میں قضاء کا مربوط نظام باقاعدہ طور پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قائم کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے ابتدائی سالوں میں ہی عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں خود خلیفہ وقت اور انتظامی افسران عدلیہ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابتداء میں اس نظام کو جاری رکھا لیکن جب عدلیہ اور انتظامیہ کی حدود کا تعین ہو گیا تو انہوں نے عدلیہ کو انتظامیہ سے مکمل طور پہ الگ کر دیا۔

عدلیہ اسی وقت آزاد ہوتی ہے جب انتظامیہ عدلیہ سے الگ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہ صرف عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کیا بلکہ خود بھی متعدد مواقع پر قضاۃ کے حضور پیش ہو کر عدلیہ کی برتری کو عملی طور پر تسلیم بھی کروایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود متعدد بار قاضی کی عدلت میں ایک عام آدمی کی طرح پیش ہوئے۔ ان کے بعد کے خلفاء بھی اپنے آپ کو احتساب سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے اور کئی مواقع پر خلفاء قضاۃ کے ہاں عام لوگوں کی طرح پیش ہوئے۔

"أن أبيا ادعى على عُمَر دعوى، فلم يعرفها، فجعلا بينهما زيد ابن ثابت، فأتياه في منزله، فلما دخلا عليه قَالَ: له عُمَر: جئناك لتقضي بيننا، وفي بيته يؤتى الحكم؛ قال: فتنحى له زيد عَن صدر فراشه؛ فقال: ها هنايا أمير المؤمنين؛ فقال: جرت يا زيد في أول قضائك، ولكن أجلسني مع خصمي، فجلسا بين يديه، فادعى أبي، وأنكر عُمَر؛ فَقَالَ: زيد لأبي: أعف أمير المؤمنين من اليمين، وما كنت لأسألها لأحد غيره؛ قال: فحلف عُمَر، ثم حلف عُمَر لا يدرك زيد القضاء حتى يكون عَمْر رجل من المسلمين[1]"

(ایک دفعہ امیر المؤمنین سیدنا عمر رضي اللہ عنہ اور سیدنا اُبی بن کعب رضي اللہ عنہ کے درمیان کسی شے پر اختلاف ہو گیا۔ ان دونوں صحابہ کرام رضي اللہ عنہما نے سیدنا زید بن ثابت رضي اللہ عنہ کو منصف مقرر کر لیا کہ جو وہ فیصلہ کریں گے وہ ہمیں قبول ہے۔ چنانچہ دونوں صحابہ کرام رضي اللہ عنہما سیدنا زید بن ثابت رضي اللہ عنہ کے گھر گئے اور

[1] وکیع،ابوبکرمحمد بن خلف، اخبار القضاء(مکتبہ التجاریۃ قاھرہ مصر 1947)109/1

ان کے سامنے اپنا کیس رکھا۔ سیدنا زید بن ثابت رضي الله عنہ نے امیر المؤمنین سیدنا عمر رضي الله عنہ کے احترام میں اُنہیں اپنے ساتھ بستر پر بٹھانا چاہا۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اپنے فریق کے ساتھ ہی بیٹھوں گا۔ چنانچہ دونوں صحابہ کرام رضي الله عنہما (مدعی اور مدعا علیہ) سیدنا زید بن ثابت رضي الله عنہ کے سامنے بیٹھ گئے۔ سیدنا اُبی بن کعب رضي الله عنہ نے اپنا دعویٰ پیش کیا جبکہ سیدنا عمر رضي الله عنہ نے اس دعویٰ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سیدنا زید بن ثابت رضي الله عنہ نے سیدنا اُبی بن کعب رضي الله عنہ سے کہا: آپ امیر المؤمنین سے درگزر فرمائیں اور اپنا دعویٰ واپس لے لیں۔ شرعی ضابطے کے مطابق حضرت زید رضي الله عنہ کو سیدنا عمر رضي الله عنہ سے قسم لینا چاہیے تھی لیکن اُنہوں نے احتراماً اس سے احتراز و تامل کیا تو حضرت عمر رضي الله عنہ نے خود قسم اُٹھائی اور فرمایا: اللہ کی قسم! زید رضي الله عنہ اس وقت تک منصبِ قضا کے لائق نہیں ہوسکتے جب تک ان کے نزدیک امیر المؤمنین عمر رضي الله عنہ اور ایک عام مسلمان برابر نہ ہو۔)

حضرت عمر رضي الله عنہ کا بطور خلیفہ کے نہایت رعب قائم تھا، لیکن وہ لوگوں کے اندر اس بات کو اجاگر کرتے تھے کہ عدل اجتماعی کے ضمن میں ان کے کسی قول و فعل کو حتمی نہ سمجھ لیا جائے بلکہ اس میں غور وخوض کیا جائے، اگر غلطی کا شبہ ہو تو انہیں عدالت میں پیش ہونے کے لیے طلب کیا جاسکتا ہے۔ آپ کے حزم و بہادری کی وجہ سے جب لوگ مروت سے پیش آنے لگے تو آپ نے ایک مجلس میں فرمایا:

"لست اريد ان تتبعو هواي فمعكم من الله كتاب ينطق بالحق فوالله لئن كنت نطقت بامر اريده فما اريده الاالحق"[1]

(میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری رائے کو تسلیم کرو تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نازل شدہ کتاب موجود ہے جو حق بیان کرتی ہے، خدا کی قسم میں کسی بھی قضیے میں جب کوئی رائے دیتا ہوں تو اس سے میرا قصد صرف صلاح اور بھلائی تک پہنچنا ہوتا ہے۔)

مسلمانوں کے دور عروج میں آزاد عدلیہ نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا بلکہ عدلیہ کی آزادی دورِ عروج کا طرہ امتیاز رہا۔ چنانچہ عدلیہ کو انتظامیہ پر واضح برتری حاصل تھی اور قضاۃ کے فیصلوں کی وجہ سے کئی وزراء جیلوں میں گئے۔ اس دور کی اسلامی تہذیب و تمدن کی ترقی عدل و انصاف کی بدولت تھی جو آزاد عدلیہ نے فراہم کی تھی۔ اس دور میں کہ جب

[1] علی طنطاوی، اخبار عمر، (دمشق، دارالمنارہ، 2004ء) 88

دیگر تہذیبوں کے تمام بادشاہ اور حکام احتساب سے بالاتر سمجھے جاتے تھے تب مسلمان خلفاء معمولی معاملات میں بھی عام رعایا کی طرح قضاۃ کے ہاں پیش ہوتے تھے اور قضاۃ عدلو انصاف کے مطابق ان کے خلاف بغیر کسی خوف کے فیصلے کرتے تھے۔

جدید جمہوری ریاستیں اور عدالتی استثناء کا تاریخی تناظر اور قوانین:

جدید تہذیب نے اپنے معاشروں میں عدالتوں کو مقننہ، بادشاہ، صدر، وزیر اعظم، کابینہ، بیوروکریسی سے زیادہ اختیارات دیے تاکہ عدالتوں پر عوام کا اعتماد قائم ہو، عدالتوں پر عوام کا اعتماد نظام کو مضبوط بناتا ہے اور ایک طاقتور نظام ملک کو ترقی دیتا ہے، تاہم انسانوں نے آگاہی، انصاف اور عدل کی یہ منزل آسانی سے حاصل نہیں کی۔ جو عناصر غالب ہوتے ہیں وہ عدالتوں کے غلبے کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتے۔ عدالتی غلبے کے حصول کے اس عزم کے ساتھ تاریخ کا ہیجان انگیز دور وابستہ ہے۔ حکمران اقلیت سے عظیم عوامی اکثریت کے مفادات اور حقوق کے حصول کے لیے ججوں نے ایک صبر آزما اور طویل جدوجہد کی ہے اور عدالتوں کے اس حق کو یقینی بنایا کہ پارلیمینٹ کا کوئی قانون اگر عام آدمی کے حقوق کے خلاف ہو تو عدلیہ اسے مسترد کر سکتی ہے۔

عہد حاضر میں عدالتی استثناء کا قانون سب سے پہلے برطانیہ میں پیش کیا گیا تھا۔ برطانیہ کے ابتدائی قانونی ذخیرے کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں عدالتی استثناء نوع کے کسی قانون کا ذکر موجود نہیں تھا۔ حتی کہ نچلی عدالت کے کسی جج کے فیصلے کے خلاف اوپر کی کسی عدالت میں اپیل دائر کرنا ایک معمول کی بات تھی۔ دسویں اور گیارھویں صدی کے اینگلو سیکسن قوانین میں یہ حق دیا گیا ہے کہ جج کے کسی بھی فیصلے کو عام آدمی بھی غلط ہونے کا دعوی کر سکتا تھا۔ حتی کہ ایسی صورت میں بھی جج کے فیصلے کو مسترد کرنا مجاز تھا کہ جب دعوی کرنے والے کے بارے میں یہ واضح ہو تا کہ اس کی جج کے ساتھ لڑائی یا مخاصمت کا کوئی معاملہ ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے ججوں کو فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آتی تھی اور وہ اپنے فیصلوں میں تذبذب کا شکار رہتے تھے کہ ان کے فیصلے کو مسترد کیا جاسکتا ہے۔

اس صورت کو ختم کرنے اور مسئلہ حل کرنے کے لیے برطانیہ میں 25 فروری 1875ء کو فیصلے کے خلاف اپیل کے حق کو ختم کیا گیا۔ یہ قانون بنایا گیا کہ ججوں کا فیصلہ حتمی ہو گا اور ان کے خلاف دعوی دائر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی بنیاد یہ بنائی گئی کہ جج کا فیصلہ ایک عوامی عمل ہوتا ہے، یوں اگر فیصلہ صحیح ہو یا اس میں غلطی کا امکان ہو، بہر صورت یہ ایک

عوامی عمل ہو گا، نہ کہ انفرادی۔ اس لیے فیصلوں کے خلاف اپیل دائر نہیں کی جاسکے گی۔ اس نئے قانون سے قبل ججوں کے فیصلے انفرادی عمل خیال کیے جاتے تھے اور اس حالت میں یہ ممکن تھا کہ انہیں مسترد کیا جاسکے یا ان میں شبہ کا اظہار کرتے ہوئے غلطی کے امکان کو غالب قرار دیا جاسکے۔ اب جبکہ یہ ایک عمل قرار دیدیا گیا تو اس کے خلاف اپیل کا حق بھی ختم کر دیا گیا۔[1]

"Doctrine of judicial immunity in America was inherited from the British common law".[2]

(امریکا میں عدالتی استثناء کا تصور برطانوی قوانین سے ماخوذ ہے)۔

نائیجیریا کے ایک سابق جج کہتے ہیں:

"A muslim Qazi giving an order of holding a view in contravention of Divine law was Kafir apostate and liable to sentence of death.3"

(اگر مسلم قاضی قانون الٰہی کے خلاف حکم دے یا قانون الٰہی کی خلاف ورزی کرے تو وہ کافر اور مرتد ہے۔ اس کی سزا موت اور ابدی عذاب ہے)۔

عدل واحتساب کا حقیقی مقصد تو ظلم کا سدباب ہے۔ جہانگیر ایک شہر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

اس شہر کے لوگ نہایت کمزور دل اور عاجز ہیں، میں نے احتیاط کی بنا پر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اہل لشکر میں سے کوئی ان کے گھروں میں گھس کر ان پر ظلم و ستم کر بیٹھے اور اس کی فریاد مجھ تک نہ پہنچے میں ہر روز اس تاریخ جب سے اس شہر میں آیا ہوں ظہر کی نماز کے بعد باوجود شدید گرمی کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہوں کہ کوئی کسی ظلم کی شکایت لے کر میرے پاس آئے۔4

[1] Jane Bray-Nicholls, "Procedure for Passing Secondary Legislation in the UK," Out-Law.com Legal News and Guidance from Pinsent Masons, , accessed December 01, 2018, https://www.outlaw.com/page-8310

[2] Ibid

[3] Shirley S. Abrahamson, Keynote Address: Thorny Issues and Slippery Slopes: Perspectives on Judicial Independence, Ohio State Law Journal, Volume 64, Issue 1 (2003)

[4] اسامہ السہلی، المحکمة الجنائية الدولية (لبنان، دارالتراث، 2018ء)، 82

برصغیر پاک وہند میں ججز کا احتساب نہ صرف عدل وانصاف کے تقاضوں کو مجروح کرنے پر کیا جاتا تھا بلکہ ان کی نجی زندگی بھی مشاہدے میں رہتی تھی۔ اگر کوئی غلطی کرتا تو اس کی گرفت کی جاتی تھی۔ جس طرح علاؤالدین خلجی کے زمانے میں ایک قاضی نے شراب پی لی۔ اس شراب کی وجہ سے قاضی کا احتساب کیا گیا اور اسے سزا دی گئی۔[1]

سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں شاہ جیمز اول کے عہد میں جسٹس ایڈورڈ کک کے فیصلے اور تبصرے عدالتی تاریخ میں بہ اعتبار اہمیت بلند درجہ اور فکری بنیاد کے حامل ہیں، جسٹس کک کا ڈاکٹر بون ہیم کیس کا فیصلہ پارلیمینٹ کی قانون سازی پر جوڈیشل ریویو کی پہلی مثال ہے جس میں انہوں نے قرار دیا کہ:

"اگر پارلیمینٹ کا کوئی ایکٹ عقل و فہم اور عام آدمی کے حقوق کے خلاف ہو تو کامن لاء اسے مسترد کرنے کی قوت رکھتا ہے۔"

انیسویں صدی میں امریکی چیف جسٹس مارشل جو دنیا کے عظیم ترین ججوں میں سے ایک سمجھے جاتے ہیں۔ "ماربری بنام میڈیسن کے مشہور مقدمے میں قانون کو نقص و خطا کی بناء پر رد کرتے ہوئے فیصلہ دیا تھا کہ آئین ہی ملک کا بنیادی اور سب سے برتر قانون ہے۔ اگر آئین اور پارلیمینٹ کے منظور کیے گیے قانون میں تضاد آئے تو ایسی صورت میں یہ عدالت کی ذمہ داری ہے کہ وہ آئین پر عمل کرے اور قانون کو رد کر دے۔

1953ء میں صدر آئزن ہاور کے عہد میں چیف جسٹس وارن نے جو حکم جاری کیے ان کے مقابل آزادی اور مساوات کے انقلابی فیصلوں سے نئی تاریخ رقم کی۔ پچھلی چند دہائیوں میں بھارتی عدالتوں نے جو متحرک کردار ادا کیا وہ معاشرے کی آرزوؤں سے ہم آہنگ اور جمہوریت کے فروغ میں بہت اہم سمجھا گیا ہے۔ بھارت میں عدالتوں نے روڈ سیفٹی، آلودگی کے خاتمے، اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلوں کی شفاف پالیسی، وی آئی پی زونز میں غیر قانونی تعمیرات ہٹانے اور کسانوں پر ناجائز ٹیکسز کے خاتمے جیسے اقدامات سے بہت روشن مثالیں قائم کیں۔ 12 جون 1975ء کو الہ آباد ہائیکورٹ کے اندرا گاندھی کی اسمبلی کی رکنیت ختم کرنے کے فیصلے کو جمہوریت کو نقصان پہنچانے سے تعبیر کیا گیا تھا لیکن وقت نے بعد میں ثابت کیا کہ اس فیصلے نے بھارت میں جمہوریت کو کس قدر مضبوط اور توانا کیا[2]۔

---

[1] ولد يوسف مولود، المحكمة الجنائية الدولية (الجزائر، دار الأمل،للطباعة والنشر والتوزيع2014ء)، 17

[2] الشامي حسين علي، الدبلوماسية(اردن، دار الثقافة للنشر و التوزيع)،165

مذکورہ بالا بحث سے واضح ہوتا ہے کہ جدید ریاست میں قانون کے حوالے سے بنیادی طور پر دو تصورات پائے جاتے ہیں۔

اول: قوانین میں سماجی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے سماج کو ریگولیٹ کرنا ہوتا ہے۔

دوسرا: قانون کو ایک ایسے تازیانہ کے طور پر استعمال کرنا ہے جس سے حکمران طبقہ کی خواہشات کے مطابق سماج بنایا جاسکے۔

قانون اور سیاست کے علم میں یہ بات زیر بحث رہتی ہے کہ قانون کو منطقی (Logical)ہونا چاہیئے۔ نیز قانون کی حیثیت طے شدہ (Legitimate) ہو۔ یہ پہلو اس لئے اہم ترین ہیں کہ تہذیبی ارتقاء نے دیکھا ہے کہ نسلی امتیاز، جداگانہ نسلی سماج اور نو آبادیاتی قوانین کے ذریعے کئی معاشروں اور ملکوں پر تھوپے گئے تھے۔ اس طرح کی درجنوں مثالیں موجود ہیں۔ آج ہندوستان میں شہریت کا متنازعہ قانون آگ لگائے ہوئے ہے۔

قانون کے حوالے سے مباحث کو سمجھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک میں قانون سازی کی اسکیم واضح ہو۔ کم و بیش تمام ممالک میں دستور کو پورے سماج پر چھتری کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ دستور شہری اور ریاست کے مابین عمرانی معاہدہ کا درجہ رکھتا ہے۔ دستور کے ذریعے ہی ممالک کے مزاج، سمت، جغرافیہ، شہریوں کو دستیاب حقوق، امور مملکت چلانے کے اداروں اور وسائل کی تقسیم کے طریق کار طے ہوتے ہیں۔ پھر دستور کی روح کے مطابق قوانین بنائے جاتے ہیں۔ بعد ازاں ان قوانین کو مؤثر بہ عمل کرنے کے لیے ایگزیکٹو کو قواعد (Rules) بنانے کا اختیار بھی قوانین ہی دیتے ہیں۔ اس سکیم کی روح یہ بنتی ہے کہ جو حق آئین دیتا ہے وہ کوئی قانون نہیں چھین سکتا اور بعینہ اس طرح جو معاملات طے شدہ طریق کار کے مطابق بننے والے قانون میں ہوں انھیں رولز کے ذریعے توڑا مروڑا نہیں جاسکتا۔[1]

اگر ایسا ہو گا تو آئین ہی یہ حق عدلیہ کو عطا کرتا ہے کہ وہ پرکھ سکے کہ کوئی قانون ماورائے اختیار تو نہیں۔ اسی منطق کا اطلاق قوانین کے حوالے سے بننے والے قواعد پر بھی ہوتا ہے۔

[1] نعمانہ، کرن عمران، دی فیڈرل کینٹ آف پاکستان، (کراچی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2016ء)، 74

باب دوم:

پاکستان میں مروج عدالتی استثناء کے قوانین اور اشکالات

فصلِ اول: پاکستان میں عدالتی استثناء کے قوانین کی نوعیت

فصلِ دوم :عدالتی استثناء کی قانونی حیثیت اور اشکالات کا جائزہ

فصلِ اول:

پاکستان میں عدالتی استثناء کے قوانین کی نوعیت

عصر حاضر میں جب ممالک کے جمہوری نظم کو زیادہ قابل اعتماد بنانے کی سعی کی جاتی ہے لہٰذا جبر واستبداد کا راستہ روکنے کے لیے عدالتوں کو بااختیار اور آزاد بنانے کی طرف بہت زیادہ توجہ دی گئی۔ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ حقوق کا تحفظ قضاء سے ہوتا ہے اور انسانی سماجی آزادیاں اسی سے برقرار ہیں۔ قانونی نصوص ومتون بھی اسی کے تحت نافذ العمل ہوتے ہیں۔ قضاء کی اس اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ قضاۃ کا مناسب احترام ووقار ہو اور یہ احترام ووقار آزادی فیصلہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں اصولی طور پر قاضی کا یہ فرض ہے کہ وہ حکم شرعی کا فیصلہ قوت نافذہ کے ساتھ کرے اور یہ قوت استقلال قضاء کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

عدلیہ کی آزادی یقینی بنانے کے لیے عدالتی استثناء ایک قانونی راستہ ہے جو جدید ریاستی قوانین میں شامل ہے۔

"Immunity prevents others from exercising powers over the person immune. Legal immunity is thus exemption from the powers of another in the same ways as liberthy is the exemption from the right of another".[1]

(استثناء کا قاعدہ دوسرے لوگوں کی طرف سے مستثنیٰ ہر کسی طاقت کے استعمال کو روکتا ہے۔ قانونی تحفظ میں کسی دوسرے کے اختیار سے ایسے ہی استثناء ہوتا ہے جیسے آزادی میں دوسروں کے اختیار سے ہوتا ہے۔)

استثناء کے قانون کے لیے انگریزی زبان میں مترادفات کے طور پر جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان میں:

استثناء (Immunity) کا لفظ Absolution, Aquittal, Exception اور Free from persecution شامل ہے۔ عدلیہ اور ججوں کو جس استثناء کے توسط سے تحفظ دیا جاتا ہے اسے عدالتی استثناء Judicial Immunity کا نام دیا جاتا ہے۔ مغربی تصورات قانون کے مطابق عدالتی استثناء جج کو ہتک کے دعووں سے تحفظ فراہم کرتی ہے۔ جج کے کسی فیصلے کی بنا پر نہ تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے اور نہ ہی جج کے فیصلوں پر کسی دباؤ، ترغیب اور لالچ کے ذریعے اثر انداز ہوا جاسکتا ہے[2]۔

---

[1] Hamid Khan, A History of judiciary in Pakistan (Karachi: Oxford University Press, 2016), 494

[2] سكاكني باية، العدالة الجنائية الدولية ودورها في حماية حقوق الإنسان،(الجزائر،دار هومه، للنشر،2018ء)،2

پاکستان میں عدالتی استثناء:

پاکستان میں عدالتی استثناء کا قانون نو آبادیاتی عہد کی یادگار ہے جب برصغیر میں برطانوی قائم تھا۔ تو انہوں نے پاکستان میں ججوں کے عدالتی استثناء کی اس تاریخی حیثیت اور اس کے مضمرات پر کہیں گفتگو نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اس قانون کو اب تک جوں کا توں باقی رکھا گیا ہے۔

"In Pakistan judicial immunity was given a very wide meaning by some decisions of higher courts. The Chief justice of higher court or Supreme Court is given vast powers for administrative, executive and legislative works of the respective court.[1]"

(پاکستان میں اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کے تناظر میں عدالتی استثناء کو نہایت وسیع مفہوم دیا گیا۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججز کو انتظامی، تنفیذی اور قانون سازی کے امور میں بہت وسیع اختیارات فراہم کیے گئے ہیں۔)

اس قانون میں واضح طور پہ یہ کہا گیا کہ عدالتی امور میں کام کرنے والے اہم مناصب جیسے جج، مجسٹریٹ، امن کار، ٹیکس جمع کرنے والے یا ان جیسے اور عہدے پہ کام کرنے والے کسی بھی شخص کے خلاف کسی بھی سول کورٹ میں مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کے خلاف کسی نوعیت کی ہتک کا مقدمہ درج کرایا جاسکتا ہے۔

1850ء میں بنائے گئے اس قانون میں درج ہے کہ:

"No judge, magistrate, justice of the peace, collector or other person acting judicially shall be liable to be sued in any civil court for any act done or ordered to be done by him in the discharge of his judicial duty, whether or not within the limits of his jurisdiction : provided that he at the time, in good faith, believed himself to have jurisdiction to do or order the act complained of ; and no officer of any court or other person, bound to execute the lawful warrants or orders of any such Judge, Magistrate, lustice of the peace, collector or other person acting judicially shall be liable to be sued in any civil court, for the execution of any warrant or order, which he would be bound to execute, if within the juris diction of the person issuing the same.2"

(عدالتی استثناء کے اس قانون میں کئی طرح کے تحفظ فراہم کیے گئے ہیں۔ جن میں بطور خاص یہ امور شامل ہیں:

[1]Hamid Khan, A History of judiciary in Pakistan (Krachi, Oxford University Press, 2001)142
[2]Pakistan Constitution, https://www.supremecourt.gov.pk/downloads_judgements/all_downloads/Judicial_System_of_Pakistan/thejudicialsystemofPakistan.pdf,1-2-2022

- یہ قانون ججوں کو ان کے فیصلوں کے تحت ہونے والے کسی بھی نقصان کی صورت میں میں ان کو ذمہ دار ٹھہرانے سے محفوظ رکھتا ہے۔
- ان پر ہتک یا ہرجانے کا مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا۔
- اگر سپریم کورٹ یا کسی بھی اعلی عدالت میں کسی ذیلی جج کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی جائے اور اس جج کا فیصلہ غلط قرار پائے تو بھی اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں اٹھایا جاسکتا۔
- سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے متعدد بیانات اور فیصلوں میں یہ بات دہرائی گئی ہے کہ ججوں کو عدالتی و فیصلہ جاتی امور میں مکمل تحفظ حاصل ہے۔
- سپریم کورٹ نے کئی بار یہ بھی واضع کیا ہے کہ ججوں کو ان کے عدالتی و فیصلہ جاتی امور کے ساتھ ساتھ انتظامی فیصلوں میں بھی مکمل تحفظ حاصل ہے۔)

پاکستان کے آئین کی دفعہ (5)199 میں ججوں کو فراہم کیے گئے عدالتی استثناء کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کون سے لوگ وجودِ شخصی (Person) کی تعریف سے خارج متصور ہوں گے اور ان پر کسی قسم کا مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کسی بھی نقصان کے ازالے کے لیے ذمہ ٹھہرائے جائیں گے۔ چونکہ مقدمات کا اندراج یا نقصان کے ازالے کے لیے ذمہ داری اٹھانے کے لیے وجودِ شخصی کا ہونا ضروری ہوتا ہے، اس لیے عدالتوں اور ان میں عملداری رکھنے والے ججز کو ریاست کا نمائندہ قرار دیا گیا ہے اور ان پر وجودِ شخصی کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔ آئین میں وجودِ شخصی کے اطلاق کی شمولیت کو واضح کرنے لیے یہ جملہ استعمال کیا گیا ہے:

"Person" includes any body politic or corporate, any authority of or under the control of the federal Government or of a Provincial Government, and any court or tribunal, other than the supreme court, a high court or a court or tribunal established under a law relating to the armed forces of Pakistan.[1]"

وجودِ شخصی کی تعریف میں ہر شخص شامل ہوتا ہے چاہے وہ سیاسی حلقے سے ہو یا کاروباری طبقے سے، اور ہر ایسا فرد یا اتھارٹی جو وفاقی یا صوبائی حکومت کے تحت کام کرتی ہو یہ سب وجودِ شخصی کی حدود میں شامل ہوتے ہیں، اسی طرح

[1]Muhammad Ashraf Qureshi v Competent Authority for (Judicial Officers) of AJ&K Judicial Service Department/ High Court of Azad Jammu & Kashmir, Muzaffarabad and 3 others, 2012 PLC (C.S) 348

عدالتیں یاٹربیونل عدالتوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، البتہ سپریم کورٹ، ہائی کورٹس اور وہ ٹربیونل کورٹس جو آرمی کے ماتحت کام کرتی ہیں وہ وجودِ شخصی کی تعریف سے خارج متصور ہوں گی)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ سپریم کورٹ، ہائی کورٹ، ٹربیونل کورٹ اور فوجی عدالتیں وجودِ شخصی کی تعریف سے خارج ہیں اور ان کے خلاف کوئی writ petition دائر نہیں کی جاسکتی۔

عدالتی استثناء کی نوعیت میں اختلاف:

پاکستان کی اعلی عدالتوں کے مابین اس حوالے سے اختلاف رہا ہے کہ آئین میں ججوں کو جو استثناء دیا گیا ہے وہ صرف عدالتی امور میں انکے فیصلوں کے ضمن میں ہے، یا اس میں انتظامی (Administrative)، تنفیذی (Executive) اور مشاورتی (Consultative) امور بھی شامل ہیں اور ان سے متعلقہ فیصلوں میں بھی انہیں تحفظ حاصل ہو گا؟ اس حوالے سے عدالتوں نے مختلف مواقع پر ملی جلی تشریحات کی ہیں۔ بعض میں کہا گیا کہ صرف جوڈیشل امور میں ججوں کو استثناء حاصل ہو گا۔ جبکہ عدالتوں کے اندر ہونے والے انتظامی وادارہ جاتی معاملات میں ان کے کیے گئے فیصلوں کو تحفظ حاصل نہیں ہو گا۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں کچھ مقدمات کے فیصلوں سے اس کی وضاحت ہو گی۔

آئین کی اس شق کی توضیحات میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آئین میں عدالتی استثناء سے امور کی نوعیت کو واضح نہیں کیا گیا ہے کہ آیا یہ مقدمات کے فیصلوں سے متعلق ہے، انتظامی معاملات بھی اس کا حصہ ہیں یا نہیں، اسی طرح یہ بھی کہ عدالتوں کے اندر مشاوتی امور بھی زیر بحث آتے ہیں۔ ایسے میں اس شق کے اندر ججوں کے ایکٹ کی نوعیت کو واضح نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے یہ مسائل جنم لیتے رہے ہیں اور اب بھی عدالتوں کے اندر ایسی درخواستیں دائر کی ہوئی موجود ہیں جن میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ججوں کے تحفظ کی واضح تشریح کی جائے اور اس میں سے ان کے مقدمات کے عدالتی فیصلوں کے علاوہ دیگر امور کو منہا کیا جائے کیونکہ اس طرح ججوں کی طاقت واختیار کا لامحدود دائرہ بن جاتا ہے جس کی مثالیں برطانیہ اور امریکا جیسے ممالک کی عصری تاریخ میں نہیں ملتیں۔

دارخواست گزاروں کے مطابق پاکستان کے اندر لاگو یہ قانون اپنی اصل میں قانونی استثناء نو آبادیاتی عہد کا ہے جب تاج برطانیہ کے ماتحت یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے عوام میں بغاوت کو کچلنے اور جبر واستبداد کو پھیلانے کے لیے

ضروری ہے کہ عدالتوں میں ہونے والی ناانصافیوں اور عوام مخالف فیصلوں کو مکمل تحفظ دیا جائے اور ان کے خلاف اپیل دائر کرنے یا انتظامی امور میں ان کی طرف سے کی جانے والی من مانیوں کو تحفظ دیا جائے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جس میں عدالتوں کے کھلے جبر واستبداد کو پوری طرح چھوٹ دی گئی تھی۔ اگرچہ اب انتظامی امور وغیرہ میں نو آبادیاتی عہد کی زیادتیوں کے ہونے کے امکانات کم ہیں لیکن پھر بھی ایک ایسے قانون پر نظر ثانی نہ کرنا کہ جس سے غلط فہمیاں جنم لے سکتی ہوں اور ان کی بنیاد پر ممکنہ طور پہ انتظامی کرپشن اور بدعنوانیوں کے دروازے کھل سکتے ہوں اسے برقرار رکھنا درست نہیں ہو گا۔

مثال کے طور پہ متحدہ پاکستان میں سماعت کیا جانے والا ایک مقدمہ اس بارے میں کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ یہ اس تناظر کا پہلا مقدمہ تھا جس میں آئین کی اس شق پر ہونے والا اختلاف کھل کر سامنے آیا۔ یہ مقدمہ 'محمد محسن بمقابلہ حکومت پاکستان' کے نام سے مشہور ہوا۔ حیدرآباد کی ایک عدالت میں ڈسٹرکٹ کورٹ کے جج نے اپنے ایک ملازم محمد محسن کو اس بنیاد پر برطرف کر دیا تھا کہ یہ سنگین رویہ جاتی مسائل اور انتظامی طور پہ اونچ نیچ کرنے کے معاملات میں ملوث ہے۔ اس ملازم نے جج کے فیصلے کے خلاف اسی عدالت میں اپیل دائر کر دی۔ عدالت نے وہ درخواست مسترد کر دی کہ وہ اپنے ہی احاطے میں کیے گئے ایک فیصلے کے خلاف سماعت نہیں کر سکتی۔ اس شخص نے بعد ازاں سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی۔ سپریم کورٹ نے وہ کیس سماعت کے لیے قبول کر لیا۔ کچھ دن بعد اس پر فیصلہ سناتے ہوئے حیدرآباد کی ہائی کورٹ کے جج کے فیصلے پر نظر ثانی کرتے ہوئے اسے معطل کر دیا اور ملازم کو واپس کام اس کی پوسٹ پر بحال کر دیا گیا۔[1]

یہ مقدمہ پاکستانی تاریخ میں اپنی نوعیت کا ایک ایسا کیس ہے جس میں ہائی کورٹ کے معزز جج کے انتظامی معاملے میں کیے گئے فیصلے کو سپریم کورٹ میں دوبارہ سماعت کے لیے قبول کیا گیا اور اس کو کالعدم بھی قرار دیا گیا۔ اس کے بعد اب تک سپریم کورٹ میں کئی ایسے مقدمات زیر سماعت آئے جو اسی نوعیت کے تھے۔ ان میں معزز ججوں نے اس کے

[1]Saad Rasool, "A Transparent Judicial Elevation Process", The Nation, 4th September, 2016, Opinion.

بر خلاف فیصلہ سنایا اور کہا کہ ہائی کورٹ کے کسی انتظامی معاملے میں کیے گئے فیصلے کو اعلی عدالتوں میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا کیونکہ انہیں اس حوالے سے مکمل تحفظ حاصل ہے۔[1]

اس طرح کے فیصلوں سے واضح ہوتا ہے کہ بعد میں اعلی عدالتیں یہ تصور پختہ کرتی آئی ہیں کہ جوڈیشل کی طرح انتظامی امور بھی آئین کی روشنی میں عدالتی استثناء کے قانون کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں اور انہیں مکمل طور پہ تحفظ حاصل ہو گا۔

دوسرے قسم کے فیصلوں کی مثال میں ابرار حسین بمقابلہ حکومت سندھ، محمد اکرام چوہدری بمقابلہ فیڈریشن آف پاکستان، ملک اسد علی بمقابلہ فیڈریشن آف پاکستان، وکالہ محاذ برائے تحفظ دستور بمقابلہ فیڈریشن آف پاکستان، جیسے مقدمات شامل ہیں۔ ان تمام کیسز میں وکلاء نے حکومتوں کے خلاف یہ مقدمات دائر کیے تھے کہ ججز کے لیے عدالتی استثناء کے جو قوانین بنائے گئے ہیں ان کی حدود مقرر کی جائیں اور بالخصوص ان کے انتظامی امور کے فیصلہ جات کو استثناء حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ان مقدمات میں جو فیصلے سنائے گئے ان میں ججز کو حاصل اس قانونی تحفظ کو جوں کا توں قائم رکھا گیا اور ان میں انتظامی امور بھی شامل رکھے گئے۔

عمومی طور پہ اعلی عدالتوں کے ججوں نے اس طرح کے اکثر مقدمات میں جو فیصلے سنائے اور انتظامی امور کو بھی تحفظ کے قانون میں شامل کیا اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ان کے انتظامی فیصلوں کو چیلنج کیا جائے تو پھر یہ اس تسلسل کے ساتھ ہو سکتا ہے کہ ججز انصاف کے کام میں اپنی ڈیوٹی پوری طرح انجام نہیں دے سکیں گے اور ان کا ارتکاز ختم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مسئلہ بھی ہے کہ بعض انتظامی امور کے فیصلے ایک جج کی بجائے بینچ کرتا ہے۔ ایسے میں اگر ان فیصلوں کو چیلنج کرنے کا اختیار باقی ہو تو مجموعی طور پہ عدالتوں کا وقار متاثر ہو گا اور ایسے مسائل جنم لیں گے جس سے عدالتوں کی ساتھ شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گی۔ اس لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ ان کے انتظامی فیصلوں کو بھی جوڈیشل معاملات کی طرح سے تحفظ دیا جائے اور انہیں قطعی چیلنج نہ کیا جاسکے۔

گویا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلی عدالتوں کے جج جب بھی کسی بھی نوعیت کا فیصلہ کرتے ہیں تو وہ بطور شخص فیصلہ نہیں کر رہے ہوتے بلکہ بطور عدالت کر رہے ہوتے ہیں جس کے خلاف رٹ دائر نہیں کی جاسکتی ہے۔

[1] Saad Rasool, "A Transparent Judicial Elevation Process", The Nation, 4th September, 2016, Opinion

تعزرات پاکستان (Penal Code) کے ضمنی پیرا گراف میں مزید کہا گیا ہے کہ جب ایک جج اچھی نیت کے ساتھ کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کوئی اقدام عمل میں نہیں لایا جاسکتا:

"Nothing is an offence which is done by a judge when acting judicially in the exerciseof any power which is, or which in good faith he believes to be, given to him by law".1

(جب ایک جج کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے تو اسے غلط یا نقصان دہ قرار نہیں دیا جاسکتا، جب تک کہ وہ ان حدود میں رہے جو اس کے لیے قانونی طور پہ مقرر کی گئی ہیں اور اچھی نیت کے ساتھ فیصلہ کرے)۔

پاکستان کی عدالتی تاریخ میں اب تک کوئی اس طرح کی مثال موجود نہیں ہے کہ جس میں کسی مقدمے میں غلط ہونے کی وجہ سے یا کسی نقصان کے ازالے کے لیے کسی جج کے خلاف کوئی درخواست دی گئی ہو۔ اگرچہ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ کسی جج کو بوجوہ سپریم کونسل میں کسی فیصلے کے تحت فارغ کیا گیا ہو اور اس کو سزا دی گئی ہو۔ مثال کے طور پہ 2019ء میں جسٹس فرخ عرفان کو کونسل نے اپنی سفارشات کے تحت ان کے عہدے سے برطرف کر دیا تھا۔ اسی طرح 2017ء میں جسٹس مظہر اقبال سدھو کو بھی ان کے منصب سے ہٹا دیا گیا تھا۔ پاکستان کی عدالتی تاریخ میں سپریم جوڈیشل کونسل کے تحت ہٹائے جانے والوں ججز میں سے سب سے پہلا نام جسٹس حسن علی آغا کا آتا ہے جنہیں 1951ء میں کونسل نے فیڈرل کورٹ میں بطور جج انہیں منصب سے علیحدہ کر دیا تھا۔[2]

اس ساری تفصیل سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ججوں کے معاملے میں عدالتی استثناء کا تعلق ان کے فیصلوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے لیکن آئین میں کوئی واضح تفریق موجود نہیں ہے کہ ججز کے کونسے فیصلوں کو کتنی حد تک استثناء اور تحفظ حاصل ہو گا، یہ صرف عدالتی فیصلوں کی تاریخ سے ثابت ہوا ہے کہ عدالتیں اور جج اس استثناء کو انتظامی امور میں بھی شامل تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ اس نوع کے غیر محدود استثناء کو چیلنج بھی کیا گیا، جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہوا ہے، لیکن عدالتوں نے استثناء کی اس حیثیت کو بغیر تبدیلی کے برقرار رکھا ہے۔

بظاہر یہ صورتحال درست معلوم ہوتی ہے کہ عدالتی استثناء کے معاملہ میں ججوں کے تحفظ کو ہر طرح کے فیصلوں میں برقرار رکھنے کے فوائد موجود ہیں کہ اس سے عدالتوں کے تشخص پر سوال نہیں اٹھ سکتا، لیکن یہ بات بھی ملحوظ رکھنی

[1]The Pakistan Penal Code, XLV of 1860، Section 77
[2]Sabir Ali, The News, List of jidges who resigned or were sent home, april 10,2019

چاہیے کہ کئی ممالک میں جیسا کہ پہلے گزر چکا، عدالتی استثناء کے حدود مقرر کی گئی ہیں اور وہاں عدالتوں کا وقار بھی متاثر نہیں ہوا، اگر پاکستان میں بھی اس کی حدود مقرر ہو سکیں تو یہ شریعت کے بھی زیادہ قریب ہو گا اور عدالتی نظم میں مزید شفافیت بھی آئے گی۔

حکمرانوں کے لیے عدالتی استثناء:

اگرچہ عمومی طور پہ دنیا کے ہر آئین کی شروحات میں یہ لکھا جاتا ہے کہ ملک کے تمام شہری قانون کے آگے برابر ہیں۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ تاریخ میں ہمیشہ سے یہ موجود رہا ہے کہ ریاست میں ایک طبقہ قانون سے بالاتر رہا ہے۔ یہ زیادہ اس نظریے کی اساس پر کہ ریاست میں انتظامی امور کو چلانے کے لیے یا ریاست کی رِٹ (writ) کو قائم کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک طبقہ بالا رہے اور عام شہریوں پر لاگو ہونے والے قوانین سے بعض میں استثناء حاصل کرے۔ اس کو عموماً سماج نے بھی ہمیشہ قبول کیا ہے اور اور نظام انصاف میں بھی اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ گویا یہ قانون ایک ایسی ضرورت کے طور پہ رہا ہے کہ جس پر نظر ثانی کرنے یا اسے تبدیل کرنے کی کوئی حاجت ہی نہیں ہے۔

جدید قومی ریاستوں کے عالمی قوانین کے اندر ریاست ایک ایسے شخصِ اعتباری کی حیثیت رکھتی ہے جو قانونی حقوق کا حامل ہے۔ البتہ یہ شخص اعتباری اپنی نمائندگی کے لیے کسی فرد کا محتاج ہے جو ہر ملک میں ایک سربراہ ریاست ہوتا ہے۔ پاکستان میں نمائندگی صدر اور اس کے مقرر کردہ صوبائی گورنرز کو حاصل ہوتی ہے۔

1610ء میں برطانیہ کے چیف جسٹس لارڈ ورڈکک نے یہ کہا تھا کہ اگر پارلیمان میں کوئی ایسا قانون یا اقدام عمل میں لایا جائے کہ جو عوامی مفاد کے برخلاف ہو تو عدالت اسے معطل کر سکتی ہے اور پارلیمان کے فیصلوں کو ایک طرف رکھا جاسکتا ہے۔ جسٹس کاک کا یہ نظریہ قبول نہیں کیا گیا، بلکہ بطور چیف جسٹس انہیں اس عہدے سے فارغ کر کے انہیں کسی اور جگہ ٹرانسفر کر دیا گیا۔ اسے واقعے کے بعد برطانیہ میں باقاعدہ یہ قانون لاگو کیا گیا کہ وزیر اعظم کو عدالتی

استثناء حاصل ہو گا اور انہیں کرمنل و سول مقدمات میں عدالت طلب نہیں کر سکتی اور نہ انہیں گرفتار کیا جاسکتا ہے۔[1]

احتساب کا تعلق صرف عوام ہی سے نہیں ہے اور محکمۂ احتساب کا قیام صرف شہریوں کی اصلاح و تربیت کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ اس کا دائرہ حکمرانوں کے احتساب تک وسیع ہے۔ چنانچہ محتسب کی ذمے داری ہے کہ وہ حکمرانوں کے خلاف شرع افعال پر بھی نظر رکھے اور حسب موقع اسے تنبیہ کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔

مولانا محمد اسحاق سندیلوی نے لکھا ہے:

"اصولی طور پر محتسب کا فرض نگرانی اور تنبیہ تک محدود ہے۔ فیصلہ یا سزا اس کے حدود اختیارات سے خارج ہے۔ اس فریضے کی ادائیگی میں وہ رعایا اور حکام کے درمیان امتیاز نہیں برتے گا۔ یہاں تک کہ خود امیر کے خلافِ شریعت افعال پر بھی اعتراض و تنبیہ کا حق اسے حاصل ہے۔ حالاں کہ ہر ملازم حکومت کی طرح وہ بھی امیر کا ماتحت ہے اور اس کا نصب و عزل بھی امیر کے اختیار میں ہے"۔[2]

اسلامی مملکت میں حکمران اہم مقام پر فائز ہوتا ہے۔ اگر اس میں صلاح پایا جائے گا تو عوام کے معاملات بھی درست رہیں گے اور اگر اس میں فساد پیدا ہو جائے گا تو عوام کے معاملات بھی فاسد ہو جائیں گے۔ اسی بنا پر اسلام میں حکمراں کے احتساب کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے اور اس کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔

امریکا میں ایک آزاد عدالتی نظام ہے۔ اس کے باوجود وہاں بھی صدر کے لیے عدالتی استثناء موجود ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ صدر کو کرمنل لاء میں مکمل عدالتی استثناء حاصل ہے جبکہ سول لاء کے مقدمات میں جزوی استثناء حاصل ہے۔ امریکا کی جمہوری تاریخ 225 سالہ ہے اور اس دوران 46 صدور منتخب ہوئے ہیں۔ اس طویل تاریخ میں کبھی بھی کوئی امریکی صدر عدالت میں پیش نہیں ہوا اور نہ ہی اپنی مدت صدرات کے دوران سزا پائی۔

---

[1] يوسف حسن يوسف، المسؤولية الجنائية الدولية لمؤسسات الدولية وكيفية التقاضي،الدولي(قاهره ، المركز القومي للإصدارات القانونية1990)188

[2] سندیلوی، محمد اسحاق، اسلام کا سیاسی نظام (دہلی، مسلم بکس،2010ء)224

جدید جمہوری تاریخ میں صدور اور ریاست کے سربراہوں پر مقدمہ نہ چلانے اور انہیں عدالتی استثناء حاصل ہونے کی کئی وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ ماہرین کے نزدیک ان میں سے بعض یہ ہیں:[1]

چونکہ ایگزیکٹو یا ریاست کا سربراہ ایک ایسی شخصیت ہوتا ہے جو ریاست کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ عدالتی مقدمات کا سامنا کرے گا تو وہ ریاستی امور میں توجہ نہیں دے سکے گا اور اس سے ملکی معاشی و سماجی مسائل گھمبیر ہوتے جائیں گے اور لاکھوں لوگوں کے متاثر ہونے کا خدشہ ہو گا۔ اس لیے جدید سیاسی نظم میں عام طور پر آئین میں یہ درج ہوتا ہے کہ سربراہ ریاست کو عدالتی استثناء حاصل ہو گا۔

اس کے علاوہ ماہرین ایک وجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ سربراہ ریاست کے ذمہ جن امور کی دیکھ بھال ہوتی ہے ان میں صرف داخلی معاملات ہی شامل نہیں ہوتے بلکہ غیر ملکی اور خارجہ امور بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے ملکی مفاد کو بالاتر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اس منصب پر براجمان شخصیت کو اس کی مدت ملازمت کے دوران عدالتوں کا سامنا کرنے سے مامون رکھا جائے تاکہ ملکی وقار و مسائل میں کوئی اونچ نیچ پیدا نہ ہو۔

دنیا کی تمام جدید جمہوری ریاستوں میں یہ ایک مسلمہ قانون ہے کہ ریاستی نظم سے متعلقہ اہم ادارے ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ اسی نوع کی شق پاکستان کے آئین میں بھی موجود ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ عدلیہ گورننس اور حکومتی معاملات سے جڑے امور اور انہیں انجام دینے والے عہدوں کو ان کی مدت ملازمت کے دوران عدالتوں میں طلب نہ کرے۔ جیسے کہ خود ججز کو بھی عدالتی استثناء حاصل ہوتا ہے۔[2]

---

[1] بشارة أحمد موسى، المسؤولية الجنائية الدولية للفرد،(دار هومه للطباعة والنشر والتوزيع، الجزائر، 2009)، 271

[2] فتلاوي ،سهيل حسن، الحصانة القضائية للمبعوث الدبلوماسي، دراسة قانونية، (مصر،المكتب المصري لتوزيع المطبوعات) 36

پاکستان کے آئین میں حکمرانوں کا عدالتی استثناء:

اِس وقت تقریباً تمام دنیا کی قومی ریاستوں میں حکمرانوں کو عدالتی استثناء حاصل ہے۔ اس کی وجہ بنیادی طور پہ ہے کہ چونکہ جدید سیاسی نظم کا ڈھانچہ سماج اور ریاست کے مابین تعلق کے توازن پر قائم کیا گیا ہے اس لیے اس امر کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی ہے ریاست اور اس کے اداروں کا وقار اور طاقت برقرار رہیں۔ ایک وجہ شاید یہ بھی ہے جب قومی ریاستوں اور جدید سیاسی نظم کا تصور وجود میں آرہا تھا تو اس وقت سماجی برتری واضح تھی اور اس سے یہ سمجھا گیا اگر ریاستی رِٹ کمزور ہوئی تو اس سے انتشار کی راہ ہموار ہو گی۔ لہذا حکمرانوں کے عدالتی استثناء کا تصور وجود میں آیا اور یہ طاقتور ہوتا گیا۔ پاکستان اگرچہ اسلامی جمہوریہ ہے لیکن اس کا سیاسی نظم انہی اساسات پر قائم ہے جن پر جدید ریاستوں کا ہوتا ہے۔ یہاں بھی صدر اور اس کے نمائندگان کو استثناء اور تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں اکثر اس قانون کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بطور قانون اس کو ختم کرنے کی سنجیدہ کوششیں نہیں ہوئیں۔ ذیل میں اس تصور کی بابت جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

پاکستان کے آرٹیکل 248 میں یہ کہا گیا ہے کہ ملک کے صدر اور گورنرز کو مکمل طور پہ عدالتی استثناء حاصل ہو گا جبکہ اس آرٹیکل کی پہلی شق میں کہا گیا ہے کہ تمام حکومتی وزراء اور سپیکر وغیرہ اپنی مدت ملازمت کے دوران اپنے کام سے متعلقہ امور میں عدالت کو جوابدہ نہیں ہوں گے۔ آرٹیکل (1)248 میں کہا گیا ہے کہ [1]:

"The President, a Governor, the Prime Minister, a Federal Minister, a Minister of State, a Chief Minister; and a Provincial Minister shall not be answerable to any court for the exercise of powers and performance of functions of their respective offices or for any act done or purported to be done, in the performance of those functions."

(ملک کا صدر، گورنر، وزیر اعظم، وفاقی وزیر، وفاقی وزیر مملکت، وزیر اعلی اور صوبائی وزیر کے عہدوں پر براجمان شخصیات اپنی حکومت میں سپرد شدہ ذمہ داریوں کی ادائیگی اور اپنے اختیارات کے استعمال کے لیے جو ان کا منصب انہیں عطا کرتا ہے، ان سب کے ضمن میں کسی عدالت کے سامنے جوابدہ متصور نہیں ہوں گے)۔

[1] Constitution of Pakistan, https://www.supremecourt.gov.pk/downloads_judgements/all_downloads/Judicial_System_of_Pakistan/thejudicialsystemofPakistan.pdf,1-2-2022

جبکہ آرٹیکل(2)248اور(3)248میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"No criminal proceedings whatsoever shall be instituted or pursued against the president or a governor during his term of office."

(صدر یا کسی گورنر کے خلاف اس کے عہدے کی میعاد کے دوران کسی عدالت میں کوئی فوجداری مقدمہ قائم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی پہلے سے زیر سماعت مقدمات جاری رکھے جاسکیں گے)۔

No process for arrest or imprisonment of the president or a governor shall issue from any court during his term of office.

(صدر یا گورنر کے عہدے کی میعاد کے دوران کسی عدالت کی طرف سے اس کی گرفتاری یا قید کے لیے کوئی حکم جاری نہیں ہو گا)۔

آرٹیکل(4)248میں کہا گیا ہے کہ:

No civil proceedings in wich relief is claimed against the president or a governor shall be instituted during his term of office in respect of anything done by him in his personal capacity whether before or after he enters upon his office.
(جن امور میں صدر اور گورنر کو خصوصی رعایات دی گئی ہیں ان میں ان کے خلاف کوئی سول مقدمات نہیں چلائے جاسکتے جب تک کہ وہ اپنے منصب پر موجود ہیں، چاہے وہ مقدمات پہلے کے ہوں یا ان کے عہدے پر براجمان ہونے کے بعد کے، وہ سب ان کے منصب پر موجودگی کے وقت تک موقوف رہیں گے)۔

فصلِ دوم:

عدالتی استثناء کی قانونی حیثیت اور اشکالات کا جائزہ

جب سے جمہوری ریاستوں کا آغاز ہوا اور ان ریاستوں کو چلانے کے لیے جو آئین اور دستور بنائے گئے وہ بنیادی قواعد وضوابط کا درجہ اختیار کر گئے۔ ان دساتیر میں دو قسم کے قوانین کا تصور ملتا ہے۔ ایک قسم کے وہ قوانین جن کا تعلق سماجی ڈھانچے کے معاملات کے ساتھ ہے کہ وہ کیسا ہو گا اور اسے کس نہج پر چلایا جائے گا۔ جبکہ دوسری قسم کے قوانین کا تعلق ریاستی نظم کو چلانے والی مشینری (حکمران، انتظامیہ، مقننہ، عدلیہ وغیرہ) سے ہوتا ہے۔ حکمران انتظامیہ بشمول عدلیہ کسی بھی ریاست میں بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیونکہ یہی وہ افراد ہوتے ہیں جو ان قوانین کا اطلاق کرتے ہیں یا جن کے مطابق وہ ریاستی نظم کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ جہاں تک اس خطے برصغیر پاک وہند کا تعلق ہے تو اس کی تقسیم سے پہلے یہاں حکومت برطانیہ کا تسلط تھا۔ وہ حکومت ایک جمہوری حکومت تصور کی جاتی تھی، گو کہ وہ جمہوری سے زیادہ تاج برطانیہ کے زیر تسلط تھی۔ وہاں پر جو قوانین تھے تقسیم ہند کے وقت وہی قوانین پاکستان میں بھی لاگو کر دیے گئے۔ اس کے بعد پاکستان میں جو باقاعدہ قوانین بنائے گئے تو ان میں انہی برطانوی قوانین کو ہی بنیاد بنایا گیا اور پھر ان قوانین میں ترامیم کی گئیں۔

ججوں کے عدالتی استثناء کے قوانین کی وجہ اساس:

پہلی وجہ:

ججوں کے عدالتی استثناء کے قوانین کی پہلی وجہ یہ ہے کہ عدالتوں کی آزادی کو یقینی بنایا جاسکے۔ اگر عدالتوں پر دباؤ ہو گا کہ ان کے فیصلوں کو چیلنج کر دیا جائے گا تو وہ منصفانہ اقدامات اٹھانے سے گریز کریں گی۔

"Foremost argument that is offered in defense of judicial immunity is the 'independence of judiciary'.It is reasoned that for proper administration of justice, judicial immunity is indispensible as without judicial immunity, litigant parties may intimidate judges in performing their functions and ultimately into subjection to their views.[1]"

(سب سے اہم دلیل جو عدالتی استثناء کے دفاع میں پیش کی جاتی ہے وہ 'عدلیہ کی آزادی' ہے۔ یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ انصاف کے مناسب انتظام کے لیے، عدالتی استثناء ناگزیر ہے کیونکہ عدالتی استثناء کے بغیر، مقدمہ باز جماعتیں ججوں کو دھمکائیں گی جس سے عدالتی پر اسس متاثر ہو سکتا ہے۔)

دوسری وجہ:

ان قوانین کے وجود کی دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس سے سسٹم میں کمزوریاں نظر آئیں گی کہ یہ شعبہ ایسا ہے جہاں فیصلے طاقتور نہیں ہوتے اور ان پر اثر انداز ہوا جاسکتا ہے۔ اس سے وکلاء طبقہ کے اندر جج بننے کی خواہش بھی کم ہوتی چلی جائے گی۔

"An argument that is proffered in favor of judicial immunity is this that lawyers would be deterred from becoming judges if immunity is removed or curtailed. This argument does not seem plausible as comparable immunity was available to barristers in England which is not available now but people still choose to become barristers. There are considerable emoluments attached to the office of judges which will always attract the attention of public to become judges.[2]"

---

[1]John Murphy, "Rethinking tortious immunity for judicial acts," Legal Studies33, no. 3 (2012): 463-464, doi:10.1111/j.1748-121x.2012.00256.x.

[2]Imran Ahsan Khan Nyazee, Jurisprudence(Rawalpindi: Federal Law House, 2015) 155

(ایک اور دلیل جو کہ عدالتی استثناء کے حق میں پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر استثناء کے قانون کو ختم کر دیا جائے یا اس کی حیثیت میں کمی کر دی گئی تو وکلا جج بننے سے ہچکچائیں گے۔ یہ دلیل البتہ قابل فہم نہیں لگتی کیونکہ انگلستان میں پہلے بیرسٹروں کو بھی استثناء دستیاب تھا جو اب دستیاب نہیں ہے لیکن لوگ اب بھی بیرسٹر بننے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ججوں کے عہدے کے ساتھ بہت سی ایسی مراعات منسلک ہیں جو ہمیشہ جج بننے کے لیے عوام کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں)۔

تیسری وجہ:

تیسری وجہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ اگر یہ قوانین نہ ہوں تو معاشرے میں لوگ سمجھیں گے کہ عدالتوں کے فیصلے حتمی نہیں ہوتے، اس طرح لوگوں کا عدالتوں کی طرف رجوع کم ہو گا۔ لہذا یہ قوانین ضروری ہیں۔

"To have finality of court decisions judicial immunity is necessary.However correction in abuse of law is in the interest of justice and equity.1"

(عدالتی فیصلوں کی حتمی حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے عدالتی استثناء ضروری ہے۔ البتہ قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے اصلاحات متعارف کرنا انصاف اور مساوات ہی کے مفاد میں ہے۔)

چوتھی وجہ:

چوتھی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان قوانین کو ختم کرنے سے عدالتوں کا وقار مجروح ہو گا سے سماج کی نظر میں ان کی جو حیثیت اور وقعت ہے وہ متاثر ہو گی۔ اس لیے ایسے قوانین کا ہونا اہم ہے۔

"The fourth reason advanced is that for ensuring dignity of judiciary, judicial immunity is indispensible. However, in present times, dignity lies in presenting oneself for accountability.2"

(چوتھی وجہ یہ ہے کہ عدلیہ کے وقار کو یقینی بنانے کے لیے عدالتی استثناء ناگزیر ہے۔ اگرچہ، موجودہ دور میں وقار واحترام یہ ہے کہ خود کو احتساب کے لیے پیش کیا جائے۔)

---

[1]Imran Ahsan Khan Nyazee, Jurisprudence 155
[2]Ibid

ان چاروں وجوہات کے جائزے سے مجموعی طور پہ جو چیز عیاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عدالتی استثناء کے قانون کا مقصد بنیادی طور پہ یہ ہے کہ عدلیہ کی آزادی وخود مختاری کو تحفظ فراہم کیا جائے اور اس کے فریم ورک کو اس قدر مؤثر بنایا جائے کہ انصاف کا ریاستی ڈھانچہ تسلسل کے ساتھ کام کرتا رہے اور اس میں انقطاع واقع نہ ہو۔

اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کا احتساب اور عدالتی استثناء:

پاکستان میں احتساب کے لیے سپریم کورٹ جوڈیشل کونسل کے نام سے ایک ادارہ ہے جو بدعنوانی اور کرپشن کی بنیاد پر ججز کا احتساب کرتی ہے۔ پاکستان میں اعلیٰ عدالتوں کے ججز کا احتساب 1973ء کے آئین کے آرٹیکل (209) کے تحت کیا جاسکتا ہے۔ آرٹیکل کی شق (6)209 میں لکھا ہے کہ سپریم جوڈیشل کونسل کے اختیارات کے تحت جج کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں غفلت برتنے، بداعنوانی اور کرپشن کی بنیاد پر معزول کیا جاسکتا ہے۔

اس آرٹیکل کے تحت سپریم جوڈیشل کونسل ایک کمیشن قائم کرتی ہے جن کے افسران کیس کی مکمل تحقیقات کرتے ہیں۔

پاکستان میں اعلیٰ عدالتوں کے بعض ججز کو مختلف وجوہات کی بنا پر احتساب کے عمل سے گزرنا پڑا ہے۔ 1960ء میں جسٹس اخلاق حسین آف مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج تھے جن پر نظم وضبط میں لاپرواہی کے الزامات تھے۔ ان کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس دائر ہوا تو ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ بیرون ملک سے ذاتی استعمال کے لیے بندوق لائے تھے۔ انہوں نے اسے ذاتی استعمال کی بجائے فرم کو فروخت کر دیا۔ اس الزام کی بنیاد پر جسٹس نے کونسل کے فیصلے سے قبل استعفیٰ دے دیا۔[1]

غلط سفارش کی بنا پر 1980ء میں پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سید صفدر شاہ کے خلاف ایک صدارتی ریفرنس دائر ہوا۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے محمد احمد خان قتل کیس میں سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے شریک ملزم پر ایف ایس ایف کے سید عباس کی رہائی کے لیے سپریم کورٹ کے جج سے سفارش کی تھی۔ سپریم جوڈیشل کونسل کے فیصلے کے بعد انہیں بھی نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔[2]

[1]Syed Shabbar Raza, Rizvi, Appointment of Judges in the Superior Judiciary of Pakistan under Article 175-A (Lahore: KLR, 2016), 5-9

[2]Syed Masroor Ahsan and Others versus Ardeshir Cowasjee and Others. PLD 1998 SC 1091

پشاور ہائی کورٹ نے بد عنوانی اور کرپشن کی بنیاد پر دو ڈسٹرکٹ اور سیشن ججز فیض اللہ خان شاہد نسیم خان کو 22 اکتوبر 2010ء کو کام سے روک دیا گیا۔ اسی طرح جسٹس سید اصغر خان، فقیر الرحمان جدون اور سجاد انور بد تمیزی کی وجہ سے پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے کام سے روک دیا۔

عدالتی استثناء پر ججوں کی تاریخی آراء:

ججز کے خلاف کسی بھی قسم کی رِٹ سے روکنے کے لیے تقریباً تمام ججوں نے ملتے جلتے ریمارکس دیے ہیں۔ ابرار حسن بمقابلہ حکومت پاکستان کیس میں جسٹس محمد یعقوب علی نے لکھا کہ بطور شہری اور قانونی تناظر میں ججز بھی دیگر شہریوں کی طرح ہیں اور ان کے مساوی حیثیت ہے البتہ جب وہ اپنی ملازمت کی ادائیگی کرتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ کسی بھی رِٹ سے محفوظ تصور کیے جاتے ہیں:

"In their private capacity, judges are like all other citizens amenable to laws of the land but immune from writ jurisdiction while performing the duties of office.[1]"

(اپنی نجی حیثیت میں جج کسی بھی عام شہری کی طرح کے فرد ہوتے ہیں جو قانون کے آگے جوابدہ ہوتے ہیں، البتہ اپنے عہدے پر کام کے ضمن میں وہ مقدمہ کا سامنا کرنے سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔)

البتہ اگر کسی جج کے خلاف کوئی انکوائری کرانی مقصود ہو یا اس کے بارے میں کوئی کیس چلانا ہو تو اس کے لیے آئین میں صرف ایک راستہ رکھا گیا ہے۔ وہ یہ کہ صدرِ پاکستان اس جج کے متعلق کوئی مقدمہ دائر کرنے کے لیے سپریم کورٹ کو خط یا درخواست لکھے۔ یہ سہولت آئین کے آرٹیکل 209 کے تحت دی گئی ہے۔ اس کی حالیہ مثال جسٹس فائز عیسیٰ کا کیس ہے جس میں صدر پاکستان نے سپریم کورٹ کو ان کے خلاف کیس سماعت کرنے کے لیے خط لکھا تھا۔

صدر پاکستان کو یہ استحقاق 17 ھویں آئینی ترمیم کے ذریعے دیا گیا ہے۔ اس سے قبل ایسی کوئی شق موجود نہیں تھی۔[2]

یہ بطور فرد کسی جج کے خلاف کیس کی سماعت کرانے کا استحقاق ہے۔ بطور ادارہ سپریم کونسل جوڈیشل بھی استحقاق رکھتی ہے اگر اسے ایسی اطلاعات موصول ہوں کہ کوئی جج اصول کی خلاف ورزی یا کسی جرم کا مرتکب پایا گیا ہے۔

---

[1] Abrar Hassan v Government of Pakistan, PLD 1976 SC 334

[2] Code of Conduct For Judges Of The Supreme Court And The High Courts, 2016, http://www.supremeCourt .gov.pk/web/page.asp?id=435. (accessed July 20, 2016)

ججوں کو حاصل ہونے والے عدالتی استثناء کے قوانین پر خدشات واعتراضات کا اظہار کرنے والے طبقات یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس قانون کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے اور یہ بھی اہم ہے کہ اس شق میں تبدیلیاں لائی جائیں کیونکہ یہ کلی استثناء شرعی قوانین کے بھی خلاف ہے اور شہری حقوق کے بھی۔ اس میں عدالتی آزادی کو یقینی بنانے کے نام پر ججوں کے طبقے کو قانون سے بالاتر بنادیا گیا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

یہ رائے اگرچہ اپنی جگہ موجود ہے اور اس کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن عملی طور پہ اس کے امکانات بطور قانون کے کلی حیثیت میں تو موجود ہیں کہ عدالتی استثناء کے قانون پر عمومی طور پہ بحث کی جائے یا اس میں ترمیم کی جائے۔ البتہ پارلیمنٹ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی فیصلے میں متعلقہ جج کو اپنے ہاؤس میں بلاسکے اور اس سے ممکنہ طور پہ فیصلے میں کسی شبے پر پوچھ گچھ کی جاسکے۔ یہ امتناع باقاعدہ آئین میں درج ہے۔ آرٹیکل 68 میں اس کی وضاحت ہے۔ یہ شق 1973ء کے آئین میں شامل کی گئی تھی، اس سے قبل 1965ء اور 1962ء کے آئین میں ایسی کوئی شق موجود نہیں تھی۔ اگرچہ سپریم کورٹ کے ججوں کی طرف سے پہلے بھی اس کا اظہار کیا جاتا رہا کہ پارلیمنٹ کسی جج سے سوال جواب یا پوچھ گچھ کرنے کا استحقاق نہیں رکھتی۔ 1958ء کے ایک مقدمے میں جس کے اندر احمد سعید کرمانی مدعی تھے اس میں جسٹس کارنیلیئس (Justice Cornelius) نے یہ فیصلہ سنایا تھا کہ:

"Each house has the right collectively to discuss subjects of its own choice without reference to the King and that individual members in debate can speak their mind with immunity, is generally recognized and accepted at the present times.1"

(ملک کا ہر ادارہ اپنی حدود میں رہتے ہوئے اور ایک دوسرے کے امور میں دخل اندازی کیے بغیر کام کرے گا۔ متعلقہ اختلافی امور پر بات کی جاسکتی ہے لیکن متعلقہ خاص فرد کی بابت اشارہ اور تنقید نہیں کی جاسکتی)۔

1976ء میں محمود علی قصوری بمقابلہ حکومت پاکستان کیس میں محمو علی قصوری نے یہ جملہ کہا تھا کہ ہم سپریم کورٹ کے حکم کو ٹشو پیپر کی طرح پھینک سکتے ہیں۔ اس جملے پر سپریم کورٹ نے توہین عدالت کا نوٹس جاری کر دیا تھا جس پر ملزمان عدالت میں پیش ہوئے تو انہوں نے اپنی بات کا دفاع کرنے کی بجائے غیر مشروط طور پہ معافی مانگ لی۔ اس پر سپریم کورٹ نے معافی قبول کرتے ہوئے کیس ختم کر دیا۔[2]

[1]Pakistan vs Ahmad Saeed Kirmani etc, PLD 1958 SC 411
[2] Republic Of Pakistan vs Mahmood Ali Kasuri, 1976 SCMR 273-275

اس واقعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اعلی عدالتیں قطعاً اس بات کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ان کے خلاف کوئی بات کی جائے یا ان کے کسی فیصلے پر برملا اعتراض یا خدشات کا اظہار کیا جائے۔

ماہرین[1] کا کہنا ہے کہ آئین کے آرٹیکل 68 میں یہ وضاحت کہ ہر ادارہ اپنی حدود میں کام کرے گا اس کو اعلی عدالتوں نے اپنی برتری اور آزادی کے لیے ہمیشہ استعمال کیا ہے اور اس آرٹیکل کا حوالہ بارہا دیا جاتا ہے کہ عدلیہ کی آزادی پر کوئی سمجوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ آرٹیکل صرف عدلیہ کے حوالے سے ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ضمن میں پارلیمنٹ اور دیگر ادارے بھی آتے ہیں۔ لیکن عملاً یہ دیکھا گیا ہے کہ عدلیہ اپنی حدود سے تجاوز کرتی ہے مگر کسی اور ادارے کو یہ حق نہیں دیا جاتا کہ وہ اس کی کارکردگی کے بارے میں بات کرسکے۔ مثال کے طور پہ کچھ عرصہ قبل سپریم کورٹ نے اورنج لائن ٹرین منصوبے کے ضمن میں فیصلہ سناتے ہوئے حکومت پر تنقید کی تھی اور کہا کہ ملک میں جمہوریت نہیں بلکہ مذاق چل رہا ہے[2]۔

یہ جملہ ماہرین کے مطابق عدالتی حدود سے صریح تجاوز ہے کہ قانونی حوالوں سے بات کرنا اور فیصلہ سنانا الگ بات لیکن حکومت پر اس طرح تنقید عدلیہ کا استحقاق نہیں ہے[3]۔

---

[1] جیسا کہ قانون دان عمران احسن نیازی۔

[2] CJP says country being run like monocracy."Dawn, October 14, 2016, Pakistan. http://www.dawn.com/news/1289880 (assessed 14th December, 2016)

[3] Judicial Appointments and Judicial Independence", http://www.usip.org/sites/default/files/Judicial-Appointments-EN.pdf, (assessed 24th November, 2016)

عدالتی استثناء کے قانونی سقم:

عدالتی استثناء کے قوانین میں کچھ سقم پائے جاتے ہیں اور کئی ماہرین اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں یہ نام نمایاں ہیں: پروفیسر ڈاکٹر محمد منیر، ڈاکٹر عمران احسن نیازی، معروف قانون دان حامد خان۔ پاکستان کے ریاستی ادارہ جاتی نظم کو دیکھتے ہوئے ماہرین آئین کی رُو سے کچھ تجاویز پیش کرتے ہیں جن میں یہ کہا گیا کہ ججوں سے متعلقہ عدالتی استثناء کی تمام صورتیں جن کا آئینی سہارا لیا گیا ہے ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس سے عملاً اب تک یہ ثابت ہوا ہے کہ ریاستی ڈھانچے میں ریاست کے دیگر اداروں کی بنسبت عدلیہ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور عدالتی استثناء سے متعلقہ تمام مقدمات میں ججز نے غیر مشروط طور پہ عدلیہ کی لامحدود آزادی کو بیان کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ آئینی رُو سے اس کی حیثیت گویا پارلیمنٹ سے بھی زیادہ ہے[1]۔

عدالتی استثناء کا قانون صرف ریاستی اداروں میں برتری کا ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ شرعی لحاظ سے ججوں اور قاضیوں کو اس قدر آزادی فراہم نہیں کی جاسکتی کہ ان کے فیصلے پر تحفظات کا اظہار یا اعتراض کرنا ہی توہین عدالت سمجھا جائے۔ اس کے علاوہ یہ قانون شہری آزادیوں کو بھی سلب کرتا ہے، اور انہیں ان کے حقوق نہیں دیے جاتے۔ یہ بھی شرعاً جائز ہے کہ وہ مجاز حدود میں رہتے ہوئے دلائل کی بنیاد پر ججوں کے کسی فیصلے پر تحفظات وخدشات کا اظہار کریں۔ شہری آزادیوں اور ان کے حقوق کا بھی آئین میں اسی طرح تحفظ موجود ہے جس طرح کہ ادارہ جاتی امور میں ریاستی ستونوں کا۔ لیکن فرد کی آزادی کو آئینی طور تسلیم کیے جانے کے باوجود عملاً عدالتی معاملات میں اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ عدالتی استثناء کا مسئلہ آئینی تناظر میں بھی قابل فحص و تمحیص ہے۔[2]

آئین میں بہت ساری دفعات ایسی ہیں جن کی وضاحت کی حاجت ہے۔ ان میں سے ایک آزادی اظہار رائے اور عدالتی استثناء کے مسائل بھی ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر آئین یہ آزادیاں فراہم کرتا ہے کہ بات کی جاسکتی ہے اور اپنے اعتراضات وخدشات کا اظہار کیا جانا جرم نہیں ہے۔ البتہ اس حوالے سے وضاحت موجود نہیں ہے کہ اس کی حدود کیا ہیں جن کا تعین ضروری ہے۔

[1] Hamid Khan, A History of judiciary in Pakistan (Karachi: Oxford University Press, 2016), 10
[2] 4 Nasim Hasan Shah, Memoirs and Reflections (Islamabad: Alhamra, 2002), 190-3.

آئین کا آرٹیکل 68 جس میں اداروں بشمول عدلیہ کی آزادیوں اور خود مختاری کا ذکر کیا گیا، اس میں میں جن امور کو نظر انداز کیا گیا ہے اور جنہیں مد نظر رکھنا ضروری ہے وہ درج ذیل ہیں[1]:

شرعی نقطہ نظر کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ حالانکہ آئین کے شروع میں یہ ذکر کیا گیا کہ ملک میں کوئی بھی قانون شریعت واسلام کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک ایسے قانون کی موجودگی جو عدل وانصاف کے شعبے سے متعلق ہو اور اس میں شرعی نقطہ نظر کو سامنے نہ رکھا گیا ہو اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ آئین میں ذکر کیے گئے شہریوں کے آزادی اظہار رائے کے حق کو بھی اس مد نظر نہیں رکھا گیا کہ وہ اس حق کے ہوتے ہوئے کسی جج یا اس کے فیصلے پر اعتراض کیوں نہیں اٹھا سکتے۔

آزادی اظہار کے عالمی قوانین اور اقدار کو بھی مد نظر نہیں رکھا گیا۔ مثال کے طور پہ امریکا، برطانیہ اور بھارت میں ججز کے عدالتی استثناء کی حدود طے کی گئی ہیں جن میں شہری آزادیوں اور انتظامی معاملات میں اونچ نیچ پر گرفت کے تمام امور واضح بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن پاکستان میں اب تک اس مسئلے پر کئی مقدمات سامنے آنے کے باوجود بات نہیں کی گئی اور نہ اس کی اجازت دی گئی ہے۔

آئین کے آرٹیکل (A)175 میں پارلیمنٹ کو یہ استحقاق دیا گیا ہے کہ وہ پارلیمانی کمیٹی برائے عدالتی تعیناتی کے توسط سے ججز کے بعض امور میں اپنی رائے دے سکتی اور ان میں فیصلہ کر سکتی ہے۔ 175(12) کے تحت پارلمانی کمیٹی سپریم جوڈیشل کمیشن کے تجویز کردہ نام کو چودہ دن کے اندر کثرت رائے سے نامزد کرنے کی پابند ہے۔ اور اگر پارلمانی کمیٹی چودہ دن کے اندر نامزد کردہ نام پر کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تو سپریم جوڈیشل کمیشن کا تجویز کردہ نام حتمی تصور ہو گا۔ اور اگر پارلمانی کمیٹی تجویز کردہ نام کو تین چوتھائی تعداد سے نامنظور کرتی ہے تو اس صورت میں پارلمانی کمیٹی چودہ دن کے اندر سپریم جوڈیشل کمیشن کو بذریعہ وزیر اعظم تحریری وجوہات بھجوائے گی۔ جس صورت میں جوڈیشل کمیشن نیے نام کو تجویز کر کے بھیجے گی۔

[1]Ghulam Murtaza Azad, "Qualifications of a Qadi", Islamic Studies 23:3 (1984), 249-250

آئین کے آرٹیکل 202 میں عدالت عالیہ اپنے یا اپنی کسی ماتحت عدالت کے معمول اور طریق کار کو منضبط کرنے کے لیے قواعد وضع کرے گی۔ جبکہ آرٹیکل 208 میں عدالتوں کے عہدیداروں اور ملازمین کے تقرر اور ان کی شرائط ملازمت کے بارے میں قواعد صدر اور گورنر کی منظوری سے وضع کیے جائیں گے۔

یہ قانون اصل میں نو آبادیاتی عہد کا ہے جس میں تبدیلی نہیں کی گئی۔ یہ قانون طاقت کی تقسیم کے عمل کے بھی خلاف ہے جو جمہوری ممالک میں ایک طے شدہ اصول ہے۔

The rationaleofthe doctrine of Separationof Powers, to my mind, is to uphold individual liberty and rule of law.Vesting of all power in one authority obviously promotes tyranny.Therefore, the principle of Separation of Powers has to be viewedthrough the prism of constitutionalism and for upholding the goals of justice in its full magnitude.1

(طاقت واختیارات کی تقسیم کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ اس سے فرد کی آزادی کو تحفظ فراہم کیا جائے اور طاقت کو ایک اتھارٹی کے اندر محصور بنانے سے گریز کیا جائے تاکہ مطلق العنانیت کو جگہ نہ ملے۔ اس لیے طاقت کی تقسم کے عمل کو آئینی طور پہ متعارف کرایا گیا تاکہ انصاف کو یقینی بنایا جائے۔)

جمہوری ممالک میں پارلیمنٹ کو یہ اختیار دیا گیا ہوتا ہے کہ وہ عدالتوں کے نظام سے متعلقہ قوانین اور نظم کے وضع کرنے میں معاونت کریں اور رائے دیں۔

امریکا اور برطانیہ کے نظام میں ججوں کا احتساب ممکن بنایا گیا ہے اور یہ راستہ رکھا گیا ہے کہ ججوں سے ان کی کارکردگی اور ان کے فیصلوں کے معاملات میں پوچھ گچھ کی جاسکے اور عمداً غلطی یا جرم ثابت ہونے کی صورت میں ان کو سزا بھی سنائی جاسکتی ہے۔ برطانیہ میں ہاؤس آف کامنز کو یہ اختیار سونپا گیا ہے۔ اگر ہاؤس آف کامنز کو کسی جج کے متعلق شکایات موصول ہوں یا انہیں اپنی تفتیش کی بنیاد پر یہ معلوم ہو کہ وہ جج موردالزام ٹھہرتا ہے تو ایسے میں ہاؤس آف کامنز یہ مقدمہ ہاؤس آف لارڈز کو بھیجتا ہے۔ وہاں دونوں فریق اپنے دلائل دیتے ہیں۔ آخر میں اگر ہاؤس آف لارڈز یہ قرار دیدے کہ جج خطاکار یا مجرم ہے تو ہاؤس آف کامنز اس کو سزا سنا سکتا ہے۔ ہاؤس آف کامنز عوامی نمائندہ ادارہ ہے جس طرح پاکستان میں پارلیمان ہے۔ آئینی اور جمہوری اصولوں کی اساس پر عدلیہ اور اس کے قاضیوں کے

[1]University of Kerala versus Council, Principals', Colleges, Kerala& Others, WRIT PETITION(C) NO.429 OF 2009. https://indiankanoon.org/doc/1460097/ (accessed 22ndApril,2017)

احتساب کو عوامی نمائندہ ادارے کے سپرد کیا جاتا ہے اور یہ استحقاق اسے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے ماہرین کی رائے ہے کہ پاکستان میں پارلیمنٹ کو یہ اختیار ملنا چاہیے اور ججز کے احتساب کو ماورائے قانون نہ سمجھا جائے۔

سربراہ ریاست کا عدالتی استثناء اور پاکستانی تناظر:

دنیا کی تمام قومی ریاستوں میں سربراہ ریاست کو قانونی استثناء حاصل ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی سیاسی نظم پارلیمانی ہے یا صدارتی۔ اسی طرح بادشاہی ڈھانچوں میں بھی یہی صورتحال رائج ہے کہ سربراہ ریاست کو جوابدہ نہیں بنایا جاسکتا۔ پاکستان بھی ایک جمہوری ریاست ہے، اس لیے یہاں بھی صدر پاکستان اور گورنر کے عہدوں کو خصوصی مراعات حاصل ہیں، بطور ریاست کے نمائندہ ہونے کے وہ اپنی مدت حکومت میں مقدمات کا سامنا کرنے سے مبرا قرار دیے گئے ہیں۔ لیکن اس قانون پر اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں کہ یہ اسلام کی رُوح کے منافی ہے۔ یہ ملک جمہوری ہونے کے ساتھ اسلامی بھی ہے اور اس کے آئین میں یہ درج ہے کہ اس سرزمین پر کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں بنایا جائے گا، اس لیے سربراہ ریاست کو دی گئی خصوصی رعایات نظر ثانی کے قابل ہیں۔

سندھ ہائی کورٹ میں صدر، وزیر اعظم اور گورنروں کو عدالتی کاروائی سے مستثنٰی قرار دینے کو غیر اسلامی قرار دینے اور قرآن و سنت سے متصادم دیگر قوانین کو کالعدم قرار دینے سے متعلق انجمن اصلاح معاشرہ کے امیر حاجی گل احمد کی آئینی درخواست کی سماعت کی گئی تھی۔ درخواست گزار نے موقف اختیار کیا تھا کہ:

ارکان قومی اسمبلی، سینٹ اور صوبائی اسمبلی نے آئین کے آرٹیکل 227.62 A-R(D-E) کی خلاف ورزی کی ہے اور اسلامائزیشن پر مبنی قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت سے پاس شدہ 15ویں ترمیم 1998ء کو تاحال سرد خانے میں ڈال رکھا ہے۔

حال ہی میں جوڈیشل کانفرنس میں چیف جسٹس آف پاکستان نے کہا ہے کہ قرآن و سنت سے متصادم قوانین کو اعلیٰ عدالتیں کالعدم قرار دے سکتی ہیں، اس لیے عدالتی کاروائی سے صدر، وزیر اعظم اور گورنروں کی استثناء کو غیر اسلامی قرار دے کر ختم کیا جائے اور قرآن و سنت سے متصادم دیگر قوانین کو بھی کالعدم قرار دیا جائے۔

پاکستان کے آئین میں موجود عدالتی استثناء کے حوالے بعض قانونی ماہرین یہ خیال کرتے ہیں کہ یہاں سربراہ ریاست کے لیے استثناء کی اہمیت زیادہ ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس قانون کی عام سماجی تناظر میں کیا حیثیت ہے اور اس کے اطلاق سے عمومی طور پہ نظام عدل پر کیا اثرات پڑ سکتے ہیں۔

ان وجوہات میں سے ایک یہ بیان کی جاتی ہے کہ پاکستان میں جمہوری سیاسی نظام مستحکم نہیں ہے۔ یہاں زیادہ تر اسٹیبلشمنٹ اور حکومت کے مابین سیاسی رسہ کشی جاری رہتی ہے جس کی وجہ سے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ہر سیاسی سربراہ ریاست کو مدت ملازمت کے دوران کئی طرح کے مقدمات کا سامنا رہتا ہے۔ یوں یہ چیز ملکی معاملات اور انتظامی ڈھانچے پر برے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس لیے اگر پاکستان میں سربراہ ریاست اور اس کے صوبائی نمائندگان گورنرز کو عدالتی استثناء حاصل ہوتا ہے تو یہ ملکی استحکام کے لیے بہتر ہو گا۔

باب سوم

مروج عدالتی استثناء کے قوانین کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ

فصل اول: مروج عدالتی استثناء اور اسلام کا منہج احتساب

فصل دوم: مروج عدالتی استثناء کے سماجی و سیاسی مضمرات: اسلامی نقطہ نظر

فصل سوم: عدالتی تحفظ سے متعلق اسلامی تعلیمات اور مروج قوانین کا تقابل

فصل اول:

مروج عدالتی استثناء اور اسلام کا منہج احتساب

اسلام کا نظام احتساب بنیادی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ قائم کرنے کے لیے ہے۔ کیونکہ احتساب کا عمل نہ تو اتنا خوفناک ہے کہ جس سے کسی شخص کے بنیادی حقوق کو خطرہ ہو اور نہ ہی ایسا پیچیدہ عمل ہے کہ جس کے لیے کسی کو بے پناہ ریاضت کی حاجت ہو بلکہ دنیا کا ہر معاشرہ احتساب کو قدر و منزلت سے دیکھتا ہے تاکہ ریاست میں ظلم وانصافی کسی بھی صورت میں ظاہر نہ ہونے پائے۔

اسلام کا منہج احتساب بلا استثناء وبلا تفریق عدل کے نفاذ پر قائم ہے۔ اللہ تعالی نے قرآن میں فرمایا ہے:

﴿وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾[1]

(اور جب لوگوں کے مابین تصفیہ (فیصلہ) کیا کرو تو عدل سے تصفیہ کیا کرو۔)

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے "لوگوں میں تصفیہ کیا کرو" فرمایا ہے۔ اور یہ بغیر کسی شرط کے بالکل عام ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اسلام کی رُو سے مقدمات کے فیصلوں میں سب انسان مساوی ہیں، مسلم ہوں یا غیر مسلم، دوست ہوں یا دشمن، حاکم ہوں یا عوام، فیصلہ کرنے والوں پر فرض ہے کہ ان سب تعلقات سے الگ ہو کر جو بھی حق و انصاف کا تقاضا ہو وہ فیصلہ کریں۔[2]

یہ آیت کریمہ اسلام کے منہج احتساب کے ضمن میں سب سے نمایاں اور بنیادی حیثیت کی ہے۔

ذیل میں اسلام کی روشنی میں منہجِ احتساب کے نمایاں نکات کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

کارِ عدل اقتدارِ اعلی کا نیابتی ادارہ ہے:

اسلام ایک مکمل دین ہے۔ اس میں ہر طرح کے انفرادی و اجتماعی احکامات موجود ہیں جن کا اتباع کرنا ہر مسلمان کی زندگی کا مقصود ہے۔ دین اسلام نہ صرف یہ کہ عبادات و اخلاقیات پر مشتمل ہدایات عطا کرتا ہے بلکہ عوامی و شہری زندگی اور ریاست وسیاست کے اصول و قواعد بھی واضح کرتا ہے۔ اور ان تمام امور کی بنیاد عدل کی قدر پر قائم کی گئی

---

[1] النساء: 58

[2] محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، مکتبہ معارف، 2002ء) 2/448

ہے۔ سیاستِ عادلہ شریعت کا ایک اہم جزو ہے۔ جبکہ سیاست ظالمہ شریعت میں حرام ہے۔ یہی عدلِ اجتماعی اسلام کی اولین پہچان بنا کہ جس میں طبقاتی تقسیم نہیں تھی اور یوں عام لوگ دین اسلام کی طرف کھنچے چلے آئے۔[1]

چونکہ کائنات کا مالک حقیقی اللہ تبارک وتعالی ہے اس لیے کائنات میں اسی کی مرضی چلے گی اور اسلامی حکومت میں اصل اقتدار اعلی اسی ذات کو حاصل ہے۔ پاکستان کے آئین 1973 میں سب سے پہلے یہی لکھا گیا ہے کہ اقتدار اعلی اللہ تعالی کی ذات ہے۔ مملکت اسلامی میں خلیفہ حقیقی مقتدر اعلی کا نائب اور اس کے تفویض کردہ اختیارات کے صحیح استعمال کا پابند ہوتا ہے۔ سیاستِ شرعیہ اور مملکت اسلامی کے تشکیلی عناصر کے مطالعہ سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان میں اولین نتیجہ یہ ہے کہ مملکت اسلامی دراصل ایک نیابتی حکومت ہے جسے حکومت الہی کی شکل میں اللہ تعالی اپنے بندوں کے سپرد کرتا ہے۔ لہذا ریاست کے اندر کوئی فرد چاہے حکمران ہو یا غیر حکمران، وہ سب برابر متصور ہوں گے اور کسی کو عدالتی احتساب سے مستثنی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ قرآن مجید میں ایسی حکومت کو خلافت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَعَدَاللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾[2]۔

(تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کیے اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا)۔

قاضی مکمل دیانت واجتہاد کے ساتھ فیصلہ کرے:

قاضی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ فیصلہ کرنے سے قبل خوب اجتہاد کرے اور آخر تک پوری دیانت داری کے ساتھ مقدمے کو آگے بڑھائے۔ البتہ قاضی سے غلطی کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ جب وہ لوگوں کے مابین عدل کے لیے فیصلہ کرے اور اس کی نیت بری نہ ہو مگر فیصلے میں غلطی ہو جائے تو اسے درگزر کیا گیا ہے۔ اسلام میں حکم ہے کہ جب ایک قاضی اپنی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے اچھی نیت کے ساتھ فیصلہ کرے تو اسے گناہ نہیں ہو گا چاہے اس سے غلطی سرزد کیوں نہ ہو جائے۔

---

[1] ابن قیم الجوزیہ، محمد بن ابوبکر، الطریق الحکمیہ (بیروت، دارلبنان، 1997ء) 14

[2] النور: 55

ایک حدیث مبارکہ جسے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا حَكَمَ الحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ۔))[1]

(جب فیصلہ کرنے والا کوئی حکم سنائے، اس میں وہ اجتہاد سے کام لے اور درست ہو تو اسے دو اجر ملیں گے، اور جب وہ فیصلہ میں اجتہاد سے کام لے مگر اس سے غلطی ہو جائے تو اس کو ایک اجر ملے گا)۔

ایک حدیث مبارکہ ہے، حضرت ابو درداء سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((الْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ: وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ، وَاثْنَانِ فِي النَّارِ، فَأَمَّا الَّذِي فِي الْجَنَّةِ فَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضَى بِهِ، وَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَجَارَ فِي الْحُكْمِ، فَهُوَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ قَضَى لِلنَّاسِ عَلَى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ۔))[2]

(قاضی تین طرح کے ہوتے ہیں ان میں سے دو جہنم میں اور ایک جنت میں جائے گا۔ وہ شخص جس نے حق کو جانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا وہ جنتی ہے، وہ شخص جس نے حق کو جانا مگر اس کے مطابق فیصلہ نہیں کیا بلکہ ظلم کیا وہ جہنم میں جائے گا، اور وہ قاضی جس نے حق کو بغیر جانے جہل کے ساتھ فیصلہ کیا وہ بھی جہنمی ہے)۔

طبقاتی تفریق کی کوئی اہمیت نہیں:

دینِ اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ اپنے ملک اور رعایا میں سب کے ساتھ منصفانہ سلوک اختیار کرنا چاہیے، کسی گروہ یا شخص کو فوقیت نہیں دینی چاہیے۔ مراعات، حیثیت و مرتبہ، حقوق و فرائض اور فوائد کی تقسیم میں، معلومات کے اکٹھا کرنے اور فیصلہ سازی میں سب لوگوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جانا چاہیے۔ قانون کے تحت تمام شہریوں کو برابر اور منصفانہ سلوک کا حق حاصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو حق دینے میں ہمیشہ انصاف سے کام لیا۔ ایک بار ارشاد فرمایا:

((إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ، أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ، وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الحَدَّ، وَايْمُ اللَّهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَ))[3]

---

[1] بخاری، الجامع الصحیح، باب فضل اجر الحاکم ازاجتهد فاصاب آواخطا، ح: 7352

[2] السجستانی، ابو داود، سنن ابوداود، باب فی القاضی یخطئ، ح: 3573، صحیح عند الالبانی رحمہ اللہ

[3] بخاری، الجامع الصحیح ، باب الغار، ح: 3475

(تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب اُن میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اُسے چھوڑ دیتے تھے لیکن جب کوئی عام آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دیتے تھے۔ اللہ کی قسم! محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا)

اسلام میں سب افراد کے ساتھ ایک جیسا برتاو کیا جاتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ آپ کے والدین یا آباؤ اجداد کہاں پیدا ہوئے تھے، آپکی نسل، مذہب یا کتنی دولت آپ کے پاس ہے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر سب لوگوں کو مساوات حاصل ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں تمام شہریوں کو سیاسی مساوات حاصل ہے۔ قانونی مساوات کی رو سے قانون کی نظر میں سب شہری برابر ہیں۔ سماجی مساوات میں ہر قسم کی طبقاتی تقسیم ممنوع قرار دی گئی۔ معاشی مساوات دیگر سیاسی اور سماجی مساوات کو مضبوط کرنے کے لیے از حد ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرمایا کہ:

((عَنْ أَبِی نَضْرَۃَ حَدَّثَنِی مَنْ سَمِعَ خُطْبَۃَ رَسُوْلِ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَسْطَ أَیَّامِ التَّشْرِیْقِ، فَقَالَ: یَا أَیُّہَاالنَّاسُ! اَلَا إِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاکُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی أَعْجَمِیٍّ وَلَا لِاَعْجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلٰی أَسْوَدَ، وَلَا لِأَسْوَدَ عَلٰی أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوٰی-))[1]

(ابو نضرہ کہتے ہیں: مجھے اس آدمی نے بیان کیا جس نے ایام تشریق کے وسط میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ سنا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لوگو! تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، خبر دار! کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر تقویٰ کے ساتھ۔)

حکمرانوں کے عدل اور ان کے احتساب کے حوالے سے خلفاء راشدین کی مثالوں سے تاریخ کا ذخیرہ لبریز ہے۔ اس ضمن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عہد ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کا رعب اور دبدبہ ہونے کے باوجود خود کو کبھی احتساب سے ماورا نہیں رکھتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے حزم و بہادری کی وجہ سے جب لوگ مروّت سے پیش آنے لگے تو آپ نے انہیں ایک مجلس میں فرمایا:

"لست اريد ان تتبعوا هواي فمعكم من الله كتاب ينطق بالحق فوالله لئن كنت نطقت بامر اريده فمااريده الاالحق"[2]

---

[1] ابن حنبل،احمد بن حنبل ،مسند احمد، ح: 4568 ، صحیح

[2] علی طنطاوی، اخبار عمر،61

(میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری رائے کو تسلیم کرو تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نازل شدہ کتاب موجود ہے جو حق بیان کرتی ہے، خدا کی قسم میں کسی بھی قضیے میں جب کوئی رائے دیتا ہوں تو اس سے میرا قصد صرف صلاح اور بھلائی تک پہنچنا ہوتا ہے)۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معزول کیا تو وہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور فرمایا کہ میں اپنی معزولی کے فیصلے پر آپ سے وضاحت چاہتا ہوں کہ آپ نے مجھے کن اسباب کی وجہ سے معزول کیا، امیر المومنین نے ان کی اس بات پر برا نہیں منایا اور نہ وضاحت دینے کو اپنی توہین خیال کیا بلکہ آپ نے ان سے فرمایا کہ یہاں اکیلے میں اس مسئلے پر بات کرنے سے بہتر ہے کہ ہم مسجد نبوی میں سب لوگوں کے سامنے مکالمہ کریں، اگر میں غلط ہوا تو عامۃ المسلمین میرا محاسبہ کر سکتے ہیں اور اگر میرا فیصلہ ٹھیک ثابت ہوا تو آج کے بعد تم مجھ سے اس مسئلے پر بات نہیں کرو گے اور نہ دوسروں کو اکساؤ گے۔ اس کے بعد مسجد نبوی میں تمام صحابہ جمع ہوئے آپ نے کھڑے ہو کر ان کے سامنے اپنا موقف پیش کیا جب آپ نے اپنی بات مکمل کر لی تو مجمع میں سے ایک کم عمر لڑکا کھڑا ہوا جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا رشتہ دار تھا اور کہا اے امیر المومنین کیا آپ مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیں گے؟ آپ نے اسے اجازت دی تو اس نے کہا:

"انک یا امیر المومنین لم تنصف خالدا و انک لتحقد علیہ"

(آپ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے انصاف نہیں کیا آپ ان سے بغض رکھتے ہیں)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر غصہ میں نہیں آئے بلکہ نرمی سے فرمایا:

"یا بنی انک حدیث السن ومغضب من اجل رقرابتک فاصبر حتی تسمع الرائی"

(برخوردار تم ابھی نوعمر ہو اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے قرابت کی وجہ سے غصے میں ہو حوصلہ رکو اور طرفین کی باتوں کو غور سے سنو)

پھر پورا دن حضرت عمر اور خالد بن ولید صحابہ کے سامنے مکالمہ کرتے رہے اور اپنے اپنے دلائل پیش کرتے رہے اس دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سخت جملوں کا سامنا بھی کرنا پڑا بالآخر صحابہ کرام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کو درست تسلیم کیا اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی کو ٹھیک سمجھا گیا[1]۔

[1] عبداللطیف الانصاری، سوسیولوجیا الأزمہ (بیروت، المؤسسہ العربیہ، 2000ء) 223

حاکم کو کوئی استثناء حاصل نہیں:

اسلام میں حکمران کو کسی صورت عدالتی معاملات میں استثناء نہیں دیا گیا، بلکہ یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ حاکم کی ذات سب سے زیادہ عدل پسند ہونی چاہیے۔ سیاست وحکمرانی کے باب میں فقہاء نے جو کتب تصنیف کیں ان میں ماوردی رحمۃ اللہ کی کتاب الاحکام السلطانیہ کو جو مقام اور اہمیت حاصل ہوئے وہ کسی اور فقیہ کی کتاب کو حاصل نہ ہو سکے۔ ماوردی حاکم کے لیے عادل ہونے کی شرط کو ضروری قرار دیتے ہیں اور عدل کے فوائد پر بھی گفتگو فرماتے ہیں کہ اس کے بغیر سلطنت میں امن کا قیام ممکن نہیں ہو سکتا، وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا جوہری مقصد رعایا کی بہبود و فلاح ہوتا ہے، وہ خلیفہ کو بھی تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر وہ عدل و انصاف قائم نہیں کرے گا تو عوام کے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا ہونے لگی جو اس کے اقتدار کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔[1]

تاریخ میں اس حوالے سے ایک واقعہ منقول ہے:[2]

زمام خلافت سنبھالنے کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کاروبار متاثر ہوا تو انہوں نے چند صحابہ کرم رضوان اللہ علیہم اجمعین سے پوچھا کہ کیا وہ روزانہ تین درہم بیت المال سے معاوضہ لے سکتے ہیں انہوں نے اس پر رضامندی ظاہر کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے سب لوگوں کو مسجدِ نبوی میں جمع کیا اور فرمایا اے لوگو عمر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ نے بھی مجھے بیت المال سے روزانہ تین درہم معاوضہ لینے کی اجازت دی ہے کیا تم اس کی اجازت دیتے ہو؟ سب نے کہا ہاں ہم راضی ہیں مگر مسجد کے ایک کونے سے ایک بدو کی آواز آئی اس نے کہا ہم اجازت نہیں دیتے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس سے پوچھا تم کیوں نہیں اجازت دیتے تو اس نے جواب دیا:

" لان أهل البادية غيرممثلين فى هذا الجمع"

(کیونکہ اس مشاورت میں دیہات کے لوگوں کی نمائندگی موجود نہیں ہے)۔

---

[1] الماوردی، علی بن محمد،الاحکام السلطانیہ (قاهره ، دارالحدیث،2010ء)112

[2] ابن تیمیہ، احمد بن عبدالحلیم،السیاسہ الشرعیہ (ریاض، دارالسلام،1999ء) 77

اس کے بعد صحابہ کرم رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مجمع سے پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ دیہات کے لوگوں کے نمائندے موجود ہیں اور انہوں نے رضامندی کا اظہار کیا ہے تب خلیفہء مسلمین نے بیت المال سے تین درہم معاوضہ لینا شروع کیا۔

مسلمانوں کے حاکم کو گھر کی ضرورت پوری کرنے کے لئے تین درہم کی ضرورت ہے جسے وہ بیت المال سے لینا چاہتا ہے وہ اس کو اجرت اور معاوضہ کا نام دیتا ہے کیونکہ وہ اپنی ذات کو امت کا ترجمان اور خادم سمجھتا ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے مشاورتی کمیٹی سے مشاورت کافی نہیں سمجھی تمام لوگوں کو جمع کر کے ان سے اجازت طلب کی، اس دوران ایک بدو نے کہا:

"ما رضينا" ہمیں منظور نہیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس پر براہم نہیں ہوئے، بلکہ اس کے اعتراض کو قابلِ اعتبار سمجھتے ہوئے مدینے سے باہر کے نمائندوں سے منظوری لی۔ جب وہاں کے تمام افراد راضی ہو گئے تب آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی اجرت لینا جائز سمجھی۔

اسلامی فقہ اور قانون کے ماہر خلیل عثمان عوام اور حاکم کی مساوی حیثیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لم يعتبر الفقه الاسلامی الوالی صاحب الحق فی السيادة بل اعتبرها حقا للامةوحدها يمارسه الوالی كاجير او وكيل عنها فيمكنهابهذا عزله ان وجدت مبررات لذالک ومعنی هذاان الامّة مصدر السلطات فی الاسلام"[1]

(اسلام نے حاکم کو حکومت اور سیادت کا حقدار نہیں ٹھہرایا ہے بلکہ یہ حق صرف امّت کا ہے، حاکم امّت کے خادم یا نائب کے طور پر اس حق کو استعمال کرتا ہے اگر جائز وجوہات پائی جائیں تو امت اسے معزول کر سکتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں امت اختیارات کا منبع ہے۔)

اسلامی تعلیمات کے مطابق حاکم بالادست نہیں ہوتا بلکہ عوام کا نمائندہ اور اپنے ہر فعل کا جواب دہ ہوتا ہے۔

[1] هانی عمر،سید ،الدیمقراطية الاسلاميه (قاهره ، المكتب الفنی، 2017ء)، 29

ایک دفعہ ابو مسلم الخولانی رحمۃ اللہ [1] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، آتے ہی سلام کیا اور فرمایا:

" السلام علیک ایھا الاجیر"

(اے خادم تم پر سلامتی ہو)۔

حاضرین نے ٹوکتے ہوئے کہا اجیر (خادم) نہیں، امیر کہو، آپؓ نے دوبارہ اجیر کہہ کر سلام کیا، لوگوں نے تین بار ٹوکا لیکن آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ہر بار وہی جملہ کہا اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

" لا بل انت اجیر"

(تم خادم ہی ہو)۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے برا نہیں مانا بلکہ آپکو ساتھ بٹھا کر فرمایا مجھے کچھ نصیحت کریں [2]۔

ججز احتساب سے ماورا نہیں:

عدل کا تقاضا حقوق و فرائض کے مابین توازن کو قائم کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں عدل وانصاف پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور اسے تقوی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر عدل نہیں ہو گا تو اس کا برعکس ظلم کا غلبہ ہو گا۔ اس منکر کو ختم کرنے کے لیے جہاں دیگر ریاستی اقدامات کی ضرورت ہے وہاں اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قضاۃ کا بھی احتساب یقینی بنایا جائے۔ احتساب کی وجہ سے ججز کے ماتحت عملہ جو کہ عام طور پہ رشوت ستانی جیسے امراض میں ملوث ہوتا ہے اس کی حوصلہ شکنی ہو گی۔ عدلیہ کے احتساب کی وجہ

[1] مسلم الخولانی کا اصل نام عبداللہ بن ثوب تھا آپ یمن مین پیدا ہوے۔ آپ عہد نبوی میں مسلمان ہوئے مگر زیارت نبوی سے مشرف نہیں ہو سکے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں مدینہ منورہ تشریف لائے۔ آپ کا شمار اونچے درجے کے حفاظ حدیث اور اولیاء اللہ میں ہوتا ہے، صاحب کشف وکرامت اور صوفی وعابد وزاہد اور جنگجو انسان تھے۔ صبر واستقامت کی اپنی مثال آپ تھے۔ آپ ان "آٹھ اولیاء" میں سے تھے،۔ آپ کی وفات 62ھ میں ہوئی۔

[2] ابن تیمیہ، احمد بن عبدالحلیم،السیاسہ الشرعیہ ،114

سے قانون شکنی کے امکانات میں کمی واقع ہوتی ہے۔ججز کے احتساب کی وجہ سے معاشرے میں نظامِ عدل پر بھروسہ بڑھتا ہے۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"فإن الشريعة مبناها وأساسها على الحكم ومصالح العباد في المعاش والمعاد وهي عدل كلها ورحمة كلها ومصالح كلها وحكمة كلها۔ فكل مسألة خرجت عن العدل إلى الجور، وعن الرحمة إلى ضدها وعن المصلحة إلى المفسدة، وعن الحكمة إلى العبث فليست من الشريعة وإن أدخلت فيها بالتأويل. فالشريعة عدل الله بين عباده، ورحمته بين خلقه، وظله في أرضه، وحكمته الدالة عليه وعلى صدق رسوله صلي الله عليه وسلم أتم دلالة وأصدقها[1]۔"

(شریعت کی بنیاد حکمتوں اور دنیا وآخرت میں لوگوں کی بھلائی کے اوپر رکھی گئی ہے۔ شریعت بلاشبہ ساری ساری عدل کا نام ہے، یہ بھلائی وحکمت کا نام ہے۔ ہر وہ مسئلہ جو عدل کی حدود سے ظلم کی حدود میں داخل ہو جائے ،یا رحمت سے سختی کے زمرے میں چلا جائے، مصلحت وفلاح سے فساد کی طرف چلا جائے یا حکمت سے نکل کر عبث بن جائے تو وہ شریعت کا حصہ نہیں ہو سکتا چاہے اسے جبری تاویل کے ساتھ اسے اسلامی کہہ بھی دیا جائے۔شریعت تو لوگوں کے مابین عدل الٰہی کے قیام کا نام ہے۔یہ اس کی رحمت کا تو ہے، زمین پر خالق کا سایہ ہے، اور اس ذات کی سچائی اور رسول اللہ ﷺ کے صدق پر دلالت کا نام ہے۔)

اسلامی تاریخ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قضاۃ اور عمال کو احتساب سے بالاتر نہیں رکھا گیا۔ صدر اسلام میں عمال کو دوسرے علاقوں میں متعین کیا جاتا تھا اور وہی لوگ قاضی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اگر ان علاقوں سے عوام کی جانب سے خلیفہ کو عمال کی شکایت موصول ہوتی تھی تو انہیں فوری طور پہ احتساب کے عمل سے گزارا جاتا اور قاضی یا عامل کا جرم ثابت ہو جاتا تو اسے سزا دی جاتی تھی اور اسے فورا معزول کر دیا جاتا تھا۔ عمال یا قضای کے احتساب کے طریقہ کار میں سب سے پہلے گواہ پیش کیے جاتے تھے۔ خلیفہ وقت مدعی اور مدعی علیہ کے ثبوتوں کی چھان بین کرتا ،اگر نتیجہ میں ثابت

[1] ابن قیم الجوزیہ،محمد بن ابوبکر،الطرق الحکمیہ، 82

ہو تا کہ قاضی نے کوئی جرم کیا ہے یا فیصلہ کرنے میں جانبداری سے پیش آیا ہے تو اسے معزول کر کے سزا سنائی جاتی تھی۔

عہد نبوی ﷺ اور خلافت راشدہ کے ادوار سے مکمل آگہی ملتی ہے کہ کس طرح قضاۃ کو بھی احتساب سے گزرنا پڑتا تھا۔ ان ادوار سے جن اہم نکات کا پتہ چلتا ہے وہ درج ذیل ہیں:[1]

1- احتساب ایک لازمی و قطعی امر ہے جس سے روگردانی یا فرار کا کوئی جواز نہیں۔

2- احتساب کے عمل میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔

3- احتساب کا عمل ہر قسم کی رُورعایت، اقرباپروری اور تعلق سے بالاتر ہے۔

4- احتساب کا اصل مقصد عدلیہ کے وقار اور اعتماد کو بحال رکھنا ہوتا تھا تاکہ عوام کو ریاست پر بھروسہ رہے۔

احتساب کے لیے تحقیقاتی کمیشن:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں قضاۃ کے احتساب کے لیے تحقیقاتی کمیشن کے قیام کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ محمد مسلمہ رضی اللہ عنہ عمال کے کاموں اور ان کی کارکردگی کے بارے میں تحقیق کرتے تھے اور اس کی رپورٹ خلیفہ کو دیتے تھے۔ ابن اثیر کہتے ہیں:

"وأول من عين شخصاً مخصوصاً لاقتصاص أخبار العمال، وتحقيق الشكايات التي تصل إلى الخليفة من عماله، وهو محمد بن مسلمة[2]"۔

(سب سے پہلا ایسا فرد جو عمال کے احتساب اور ان کی طرف سے ملنے والی شکایات کی تحقیق کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آگاہ کرنے کے لیے متعین کیا گیا وہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ تھے۔)

اسی طرح عام لوگوں سے مسلسل خلفاء سوال کرتے تھے کہ اگر کسی پر عامل یا قاضی کی جانب سے ظلم کیا گیا ہو تو بتایا جائے تاکہ اسے انصاف ملے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک شخص نے شکایت کی کہ فلاں عامل نے اس کو سو کوڑے مارے

[1] ابن قیم الجوزیہ، محمد بن ابوبکر، الطرق الحکمیہ، 92-97

[2] ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد، روضۃ الناظر (بیروت، درالعاصمہ، 2001ء) 61

ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا تم بدلہ لینا چاہتے ہو؟ اس نے جواب دیا ہاں! اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اٹھو اور بدلہ لو، اس مجلس میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ آپ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اے امیر المؤمنین اگر عاملین کے لیے پالیسی اختیار کی جائے تو یہ ان پر شاق گزرے گا اور یہ مستقل طریقہ بن جائے گا، اور آپ کے بعد آنے والے بھی اس عمل کو اختیار کیے رہیں گے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ان کا احتساب نہ کروں جبکہ میں نے حضور ﷺ کو اپنی ذات سے بھی بدلہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔[1]

اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا منہج احتساب کسی استثناء کا قائل نہیں ہے۔ اسلام میں قضاء کا عمل اتنا اہم اور عظیم سمجھا گیا کہ اسے خلفاء وحکام کی ذمہ داری بنایا گیا، تاکہ اسے سب بلند مقام حاصل ہو اس میں غلطی کا احتمال نہ رہے۔ خلافت راشدہ کے آغاز میں صرف خلفاء ہی قضاء کے امور انجام دیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلی دفعہ یہ منصب دوسروں کو سونپنے کی روایت کا آغاز کیا۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں پہلی بار مدینہ میں قضاء کے منصب پر فائز ہوئے۔ بصرہ میں حضرت شریح رحمہ اللہ کو قاضی مقرر کیا گیا، جبکہ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں اس منصب کی ادائیگی کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اصولی طور پر منصب قضاء خلافت کے فرائض میں سے ہے۔ یو ان مناصب حکومت میں سے ایک جو خلافتِ شرعیہ کے ماتحت ہیں۔ لیکن چونکہ خلیفہ اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے اسے ادا نہیں کر رہا ہوتا اس لیے قاضی کو خلیفہ کا نائب متصور کیا جاتا ہے۔ لہذا اقضاء کے منصب کی یہ اہمیت وعظمت اس بات کی غماز ہے کہ کارِ عدل اور بالخصوص احتساب کے عمل میں شفافیت کا ہونا فرض ہے اور کوئی فرد اس میں بالا دست یا مستثنی نہیں ہو سکتا۔

[1] ابن قیم الجوزیہ، محمد بن ابوبکر، الطرق الحکمیہ، 58

فصل دوم:

مروج عدالتی استثناء کے سماجی وسیاسی مضمرات: اسلامی نقطہ نظر

دینی نقطہ نظر اور مروج قوانین کے تحت بھی عدالتی استثناء کے کچھ سماجی وسیاسی مضمرات ہیں جن میں سے بعض مثبت ہیں اور بعض منفی۔ ضمنی طور پہ اس حوالے سے کچھ اشارات سابقہ ابواب میں بھی گزر چکے ہیں۔ اِس باب کے اندر اسلام کی روشنی میں عدالتی استثناء کے سماجی وسیاسی مضمرات کو ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(1) معاشرے میں عدل کا قیام:

مجاز حدود کے اندر عدالتی استثناء کا قانون دراصل سماج کے اندر ایک اساسی تقاضا ہے اور اس کے فائدے سامنے آئے ہیں۔ ریاستی سطح پر قضاء سے متعلق عدالتی استثناء کئی حوالوں سے سود مند ہے اس لیے اس کی ضرورت موجود ہے۔ ریاست کا دائرہ کار بہت زیادہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور اس کی بے شمار ذمہ داریاں ہوتی ہیں، اس سارے عمل سماج کے اندر عدل کا حقیقی وشفاف قیام محور کی حیثیت رکھتا ہے۔ بالخصوص عصر حاضر میں معاشرے کے اندر عدل کا قیام ایک بہت بڑا چیلنج ہے، اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے عدالتی استثناء کی اہمیت وفائدے بڑھ جاتے ہیں، اسی لیے تقریباً معاشروں میں اس کا تصور موجود ہے۔

"وإذا ضاقت السبل وكثرت العقبات في وجه إقامة العدل ومقاومة الظلم في المجتمع،ولم يكن هناك شئ يزيل هذا الظلم إلا بوضع حماية للقضاء والقضاة،فإن قواعد الشريعة العامة وروحها تتسع لذلك وتستوعبه،بل قد يكون واجباً،عملاً بالقاعدة الفقهية:ما لايتم الواجب إلا به فهو واجب."[1]

(جب سماج میں اقامت عدل کے راستے میں دشوارایاں کھڑی ہو جائیں اور ظلم کا خاتمہ مشکل ہو، اور ایسے میں اس کا حل اگر صرف نظام قضاء اور قضاۃ کو تحفظ واستثناء فراہم کرنے سے ممکن ہوتا ہو تو شریعت کے قواعد اور اس کی روح اس تصور کو مجاز بناتے ہیں، بلکہ اس فقہی قاعدے کے تحت ایسا کرنا واجب ہو گا: جس امر کے ساتھ کسی واجب کا قیام لاحق ہو جائے وہ امر بھی واجب کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔)

[2] أبوفارس،عبدالقادر،القضاء في الإسلام(اردن، مكتبه الاقصى،2004ء) 183

(2)سازشی اور چال باز عناصر سے تحفظ:

شرعی حوالے سے مجاز حدود کے اندر عدالتی استثناء سیاستِ شرعیہ کی رُو سے اہمیت کا حامل ہے۔ اسلام اس کی تائید کرتا ہے اور اس کے مروج قوانین میں موجود مفاسد کا ازالہ کر دیا جائے تو یہ ایک خیر کا عمل ہے۔

"وحصانة القاضي هي من المصالح المرسلة التي لم يدل عليها دليل بعينه،لكنها مما يجلب المصلحة ويدفع المفسدة،ولا ضرر فيها على حقوق الغير،إذ ليس الهدف منها جعل القاضي بمنأى عن المساءلة والمحاسبة عند الخطأ،بل الغرض منها تمكين القاضي من القيام بعمله على خير وجه،وحفظه من أهل السوء والمتربصين،وهذا مما هو داخل في مصالح الشريعة وغايتها-"[1]

(قضاۃ سے متعلق عدالتی استثناء ان مصالحِ مرسلہ میں شمار ہوتا ہے جن کے لیے مستقل بالذات کوئی دلیل تو موجود نہیں ہے لیکن یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں مصلحت پوشیدہ ہے اور اس سے مفاسد کو دور کیا جاتا ہے۔ اس میں کسی کے حقوق متأثر نہیں ہوتے، کیونکہ اس کا مقصد یہ نہیں کہ قاضی کو غلطی میں احتساب سے بچایا جائے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ قاضی اپنے کام کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں اور انہیں سازشی اور چال باز لوگوں کے شر سے محفوظ رکھا جاسکے۔ اور یہ مقصد شریعت کے اغراض و مصالح میں شامل ہے۔)

(3)ریاستی عمل دخل سے تحفظ:

قومی ریاست کی بنیاد میں ریاست و سماج کے مابین توازن کو قائم رکھنا ضروری خیال کیا گیا تاکہ نہ ریاست اپنی حدود سے تجاوز کرے اور نہ سماج قوانین سے بالاتر ہو کر انکاری کا باعث بنے۔ ریاست و سماج کے درمیان یہ کشمکش ہر جگہ ہوتی ہے اور اس کے لیے عام طور پہ یہ امکان ہوتا ہے ریاست عدالتی معاملات پر حاوی ہو کر اپنے غلبے کو یقینی بناتی ہے۔ اس لیے عدالتی استثناء کا یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ عدلیہ کو ایسی مداخلت اور اس کے اثرات سے محفوظ رکھا جاسکے۔

[1] أبوفارس،عبدالقادر،القضاء في الإسلام ،184

"لا يمكن للقاضي القيام بعمله حتى يكون بمعزل عن التأثر بغيره من السلطات التنظيمية أو التنفيذية،وإلا لأدى ذلك إلى ضياع الحقوق ومعاونة القاضي على الجور والتعدي بسبب ما يحصل من تدخل في القضاء،وحيث لابد للعدل من هذه الحصانة عدل بها عن الأصل العام وهو المساواة-"[1]

(قاضی کے لیے اپنے کام کو بہتر طریقے سے ادا کرنا اس بات کے بغیر ممکن نہیں کہ اسے انتظامی و تنفیذی اداروں کے اثر ورسوخ سے دور رکھا جائے۔ ورنہ اس سے حقوق عامہ پر زد پڑے گی اور قاضی کو ناانصافی و ظلم میں معاونت کا راستہ ملے گا،لہذا عدل و مساوات کے قیام کے لیے عدالتی استثناء کا وجود ضروری ہے۔)

مروج قوانین کے تحت وضع کیا جانے والا عدالتی استثناء کا قانون پاکستان میں بعض حوالوں سے مسائل کا سبب بھی ہے، جن میں سے نمایاں مسائل یہ ہیں:

(1)عدلیہ کی لامحدود بالادستی:

پاکستان میں ججز کی تقرری کے لیے جو کمیشن موجود ہے وہ صرف قضاۃ کے مختلف مناصب پر مشتمل ہے جو طے کرتا ہے کہ عدالتوں میں کس کا تعین کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عمل کو عدلیہ کی کمزوری کا ایک سبب گردانا جاتا ہے کہ عدلیہ کو اتنا خود مختار نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی شفافیت پر سوال اٹھیں۔ ججز کی تقرری کے عمل میں انتظامیہ، وکلاء اور پارلیمان کی رائے عدالتی استثناء کے تصور کے خلاف نہیں ہے۔

Removal and appointment processes in and Pakistan provide an impression that judiciary doesn't want that any other institution or individual should meddle in its affairs or question its integrity. This means that judiciary should not be accountable to anyone except itself.[2]

(پاکستان میں ججز کی تعیناتی اور ان کی معزولی کا طریقہ کار یہ تاثر دیتا ہے کہ شاید عدلیہ اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ کوئی اور ادارہ یا فرد اس کے اندرونی معاملات میں کوئی دخل اندازی کرے یا رائے دے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ عدلیہ سوائے اپنے کسی اور کے آگے جوابدہ نہیں ہے۔)

[1] فتحی الدرینی،خصائص التشریع الإسلامي في السیاسة والحکم، 22

[2] Sajida Ahmed,Qualifications of a Qadi (Lahore, Vanguard Books, 2010) p: 250

(2)عدلیہ کی حیثیت:

اسلامی روایت کے عدالتی تحفظ کے قوانین سے یہ پتہ چلتا ہے عدلیہ خلافتی ڈھانچے کا ایک حصہ ہے اور دراصل اس کے معاملات کے لیے خلیفہ یا حاکم براہ راست ذمہ دار ہوتا ہے۔ جیسا کہ صدر اسلام میں قاضی کے فرائض خلیفہ ہی انجام دیتا تھا لیکن کچھ وقت کے بعد جب خلیفہ وقت کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اسے بذات خود انجام دے سکے تو اس کے لیے قضاۃ مقرر کیے گئے۔ جبکہ مروج قوانین میں عدلیہ کی حیثیت ریاست کے چار ستونوں میں ایک مستقل بالذات ستون کی ہے جس کے حقوق کے بارے میں باقاعدہ آئین میں وضاحتیں موجود ہیں۔

(3)عدلیہ کے اختیارات:

اسلامی روایت میں عدلیہ کے حقوق و مفادات کا خصوصی تحفظ کیا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ اس کے اختیارات کی حدود متعین کی گئی ہیں۔ اس کے لیے اسلام نے یہ اصول بتایا ہے کہ کوئی بھی فرد اپنی ذات میں بالاتر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قضاۃ کے تمام معاملات کی دیکھ بھال کے لیے کمیشن قائم کیے گئے تھے اور ان کے تمام فیصلوں کی تحقیق و تفتیش ہوتی تھی۔ حتی کہ اگر کسی کو یہ اعتراض ہوتا کہ اسے فیصلے میں شبہ ہے تو اسے توہین عدالت تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس مسئلے میں پوری تفتیش ہوتی تھی کہ عدلیہ کی جانب سے صادر ہونے والا فیصلہ درست ہے یا نہیں ؟ جبکہ مروج قوانین میں توہین عدالت کا قانون غیر شفاف ہے۔ اس کے زمرے میں کسی بھی بات کو شامل کیا جاسکتا ہے جو کہ اسلامی روایت کے منافی ہے[1]۔

(4)عدلیہ کے انتظامی امور:

مروج قوانین کے تحت عدالتی استثناء کا قانون ججز کے انتظامی معاملات کو بھی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ کوئی جج جب عدالت کے انتظامی معاملات میں فیصلہ کرتا ہے تو اس کے لیے بھی اس سے کوئی پرسش نہیں کی جاسکتی اور جواب طلبی کو غیر قانونی حیثیت حاصل ہے۔ ججز کو یہ مکمل اختیار ہوتا ہے کہ وہ اندر کے تمام انتظامی امور میں اپنی مرضی وصوابدید کے ساتھ فیصلہ کریں۔

[1] ناصر الجوفان، ضمانات عدالة القضاء في الفقه والنظام (بيروت ، دارالشروق، 2201ء) 28

اسلامی روایت میں بھی قضاۃ کو عدالت کے انتظامی معاملات میں اختیارات حاصل ہوتے ہیں ،جیسا کہ حاجب ،رجسٹرار اور کاتب کو اپنی مرضی سے متعین کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ امور نہایت محدود ہیں۔ اور اگر ان میں بھی خلیفہ یا کوئی شہری اعتراضات اٹھائیں اور انہیں کسی امر پہ شکایت ہو تو اسے مسترد نہیں کیا جاسکتا بلکہ قانونی طور پہ اس کی جوابدہی کی جاسکتی ہے۔[1]

(5)توہین عدالت کا تصور:

عدالتی استثناء کے قانون کے تحت توہین عدالت کے مسئلہ پر مزید بحث ومباحثہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ توہین عدالت کا قانون ایک ایسی دو دھاری تلوار ہے جس کے تحت جائز تنقید ورائے کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ اسلام میں بھی اس قانون کی حدود مقرر کی گئی ہیں اور جائز تنقید وبحث مباحثہ کو اس کا شار نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر کوئی فریق سماعت میں مشکلات پیدا کرے، قاضی سے بد تہذیبی سے پیش آئے یا ایسی بات کرے جس سے عدلیہ کا احترام مجروح ہوتا ہو، یا رشوت کی بات کرے تو قاضی اس کے خلاف تادیبی کاروائی کر سکتا ہے اور حتی کہ اسے قید کی سزا بھی دی اسکتی ہے

(6)حکمرانوں کے لیے عدالتی تحفظ کا تصور:

اسلامی روایت کے عدالتی تحفظ کے تصور سے واضح ہوا ہے کہ الحصانہ القضائیہ کا قانون ججز سے متعلق ہے۔ اس میں حکمران شامل نہیں ہیں۔ مروج قوانین کے سابقہ جائزے میں گزر چکا ہے کہ قانونی استثناء صرف عدلیہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کی ایک جہت حکمرانوں کے لیے بھی ہے جس کے تحت ریاست کے سربراہ اور اس کے نمائندہ گورنرز کو اپنی مدت ملازمت کے دوران کسی بھی مقدمے سے تحفظ رکھا جاتا ہے کہ ان کے خلاف کوئی کاروائی عمل میں نہیں لائی جاسکتی نہ انہیں گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں یہ قانون نو آبادیاتی عہد کا ہے اور اسے اسلامی روایت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں حکمران بھی عام آدمی کی طرح انسان ہے اور اس سے شہری کسی بھی معاملے پر پوچھ گچھ کر سکتے ہیں۔ بالخصوص اگر ان کے خلاف کوئی ٹھوس مقدمات ہیں یا شواہد ہیں تو انہیں عدالت میں حاضری سے استثناء نہیں دیا جاسکتا، ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے خلاف دائر ہونے والے مقدمے کا سامنا کریں، اگر ان پر جرم ثابت ہوتا ہے تو انہیں معزول بھی کیا جاسکتا ہے۔

[1] ناصر الجوفان، ضمانات عدالة القضاء في الفقه والنظام ، 28

اس فرق کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قومی ریاست کے اصول کی طرح اسلام میں ریاست کو بالادست تسلیم نہیں کیا گیا ہے بلکہ انسانی مساوات وعدل کا قاعدہ اہمیت کا حامل ہے جس کا تقاضا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں اور کسی کو اپنے منصب کی وجہ سے بالادست قرار نہیں دیا جاسکتا[1]۔

درج بالا اسلامی اور مروج قوانین کے تحت عدالتی استثناء کے اثرات ومضمرات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اپنے اپنے امتیازات وخصائص ہیں جن سے یہ متصف ہے۔ مثال کے طور پہ اسلام میں عدالتی استثناء کی بنیاد سیاستِ شرعیہ ہے جس میں مصالح مرسلہ اور استحسان کے فقہی قواعد کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ مروج قوانین میں اس تصور کی بنیاد قومی ریاست کے مفادات وتقاضے ہیں جو سیاسی بھی ہیں سماجی بھی۔

اسی طرح اسلام میں عدالتی استثناء کی اساسات عام اور مجموعی نوعیت کی ہیں جو ہر زمان ومکان کے لیے سازگار ہیں، جبکہ مروج قوانین میں اس تصور کی اساسات وقتی وزمانی ہوتی ہیں جو ریاست کے ڈھانچے کے اعتبار سے مختلف ہوتی اور وقت کے ساتھ تبدیل بھی ہوسکتی ہیں۔

پاکستان میں عدالتی استثناء کے قوانین کے تحت ججز کی تقرری کا اسلامی روایت کے بھی منافی ہے اوراس کا نقصان یہ ہے کہ اس میں عدلیہ کے تمام معاملات صرف ایک ہی طبقے کی گرفت میں چلے جاتے ہیں اور ریاستی انتظامیہ یاپارلیمنٹ جو کہ عوام کی نمائندہ ہوتی ہے، انہیں اس میں رائے دینے کا حق نہیں رہتا۔

[1] فتحی الدرینی، خصائص التشریع الإسلامي في السیاسة والحکم، 67

فصل سوم:

عدالتی تحفظ سے متعلق اسلامی تعلیمات اور مروج قوانین کا تقابل

مروج قوانین کے مطابق عدالتی استثناء یا عدالتی تحفظ کے بارے میں گفتگو تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ ججز کے حوالے سے عدالتی استثناء سے کیا مراد ہے؟ اور اسی طرح حکمرانوں کے لیے قانونی استثناء کا مطلب کیا ہے؟ اس کے لیے حکومتیں کیا مراعات و تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ چونکہ معاصر فقہ میں عدالتی تحفظ کا تصور بالعموم عدلیہ اور ججز کے متعلق ہے اور فقہاء نے بھی الحصانہ القضائیہ (عدالتی تحفظ) کے تحت جو تصریحات کی ہیں ان سے یہی مراد ہے، اس لیے اس باب میں بنیادی طور پہ عدالتی تحفظ کی اس مخصوص جہت پر گفتگو کی جائے گی۔

سفارت کاری سے متعلق عدالتی استثناء کا مفہوم:

البتہ فقہ میں الحصانہ القضائیہ کے عنوان کے تحت جزوی طور پہ سفارت کاروں کو حاصل ہونے والا تحفظ بھی مراد لیا جاتا ہے۔ اگرچہ صدر اسلام میں اس اصطلاح کا استعمال موجود نہیں تھا، بعد میں فقہاء نے اس کی تفصیلات پر کلام کیا، لیکن قدیم تاریخی و فقہی ادب کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے اس سے مراد سفارت کاروں کو حاصل ہونے والا تحفظ مراد ہوتا تھا، لیکن بعد میں جب قضاۃ سے متعلق احکامات مرتب کیے گئے تو پھر اس اصطلاح کا زیادہ استعمال عدلیہ سے متعلق ہونے لگا۔

"إن مضامين مصطلح الحصانة كانت معروفة لدى المسلمين منذ عهد النبي ﷺ، هي في أصلها مقررة في الإسلام، مارسها المسلمون منذ عهد النبي. كانت الحصانة- في الإسلام- تقتصر على الرسل والمبعوثين الذين يقومون بتمثيل دولة ما لدى دولة المسلمين"[1]

(حصانہ کے بارے میں مضامین و کلام عہد نبوی ﷺ کے وقت سے مسلمانوں کے ہاں ہمیشہ سے معروف رہا ہے۔ بلکہ یہ اصل میں اسلام ہی کی دین ہے کہ مسلمان اس پر رسول اللہ ﷺ کے وقت سے عمل پیرا رہے۔ ابتداء میں استثناء سفارت کاروں اور ریاستی نمائندوں کے لیے ہوتا تھا جو کسی ملک کی مسلمان ممالک میں نمائندگی کے لیے آتے تھے۔)

[1] سعود بن سعد، التنظيم القضائي في المملكة العربية السعودية (رياض، دارالنشور،2018ء) 83

سفارت کاری سے متعلقہ عدالتی تحفظ سے مراد یہ ہوتا تھا کہ ایسے لوگ چونکہ اپنی ریاست کے نمائندے ہیں اس لیے ان پر مقدمات دائر نہیں کیے جاسکتے، انہیں گرفتار نہیں کیا جاسکتا، اپنے عہدے پر ہوتے ہوئے انہیں سزا نہیں سنائی جاسکتی، ان کی جان ومال کا ترجیحی سطح پر تحفظ کیا جائے گا۔ سفارت کاری سے متعلق عدالتی تحفظ ان امتیازات وخصائص کا نام ہے جو غیر ملکی سیاسی نمائندوں کے بارے میں ہوتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پہ ان ممالک کے عدالتی نظم کے ماتحت نہیں ہوتے جہاں وہ کام کر رہے ہیں، بلکہ اپنے ملک کی حکومتوں اور اپنے ملک ہی کے نظامِ قضاء کے ماتحت ہوتے ہیں۔

اسلام میں عدالتی استثناء کے مظاہر:

معاصر فقہ میں بالعموم، یا مروج قوانین کے تحت قضاء کے حوالے سے جب عدالتی تحفظ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس سے مراد دراصل نظامِ عدل کو فراہم کیا جانے والا قانونی تحفظ ہوتا ہے کہ کس طرح اس نظام کی شفافیت ووقار کو بحال رکھا جائے۔ اسی کے ذیل میں مختلف شرائط لاگو کی جاتی ہیں اور قاضیوں کے فیصلوں کی حمایت وتنفیذ کے لیے ریاست کی جانب سے قانونی تعاون فراہم کیا جاتا ہے۔

ذیل میں اسلام میں عدالتی تحفظ کے اہم مظاہر کا جائزہ لیا جائے گا۔

(1) قضاۃ کی تقرری کے قواعد وضوابط:

قضاۃ کی تقرری کا مسئلہ صوابدیدی نہیں بلکہ اس کے لیے ان قواعد کی پابندی ضروری ہے جن کی صراحت فقہاء نے ادب القاضی میں ہے۔ فقہاء کے ہاں قضاۃ کی تقرری کے قواعد کی تشکیل الحصانہ القضائیہ کے زمرے کے تحت کی جاتی ہے۔ ان کے مطابق اس کا مقصد یہ ہے کہ عدالتی نظام کو محفوظ بنایا جاسکے اور اس ضمن میں کچھ اصول وضع کیے گئے ہیں جن کی پاسداری ضروری ہوتی ہے۔

"لایجوز القضاء الا لمن توافرت فیه شروطه التی یصح معها تقلیده وینفذ بها حکمه۔"[1]

(قضاء کا عمل صرف اسی کے لیے جائز ہو سکتا ہے جس میں اس کی شرائط موجود ہوں ایسی شرائط جو اس کی تقرری اور اس کے نافذ کیے ہوئے فیصلوں کے لیے ضروری ہوں۔)

[1] فتحی الدرینی، خصائص التشریع الإسلامي في السیاسة والحکم ، 50

حکومت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کا تعین کرے جو اس کا اہل ہو۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾[1]

(اللہ کا حکم ہے کہ امانات کو ان کے اہل تک پہنچاؤ)

مفسرین کے مطابق مناصب کو ان کے اہل افراد تک پہنچانا بھی اس کے ذیل میں آتا ہے اور یہی حکم قضاۃ کے بارے میں بھی ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"القوة في كل ولاية بحسبها، فالقوة في إمارة الحرب ترجع إلى شجاعة القلب، وإلى الخبرة بالحروب والمخادعة فيها فإن الحرب خدعة- والقوة في الحكم بين الناس، ترجع إلى العلم بالعدل الذي دل عليه الكتاب والسنة، وإلى القدرة على تنفيذ الأحكام-"[2]

(ہر شعبے کے لحاظ سے اس کی ایک صلاحیت و مہارت ہوتی ہے۔ جنگ کی قیادت میں اہلیت یہ ہے کہ دل کی مضبوطی ہو، جنگوں کا تجربہ ہو اور چال چلنا آتا ہو کہ جنگ ایک چال ہی ہے۔ جبکہ لوگوں کے مابین فیصلہ سازی کی اہلیت یہ ہے کہ اس عدل کا علم ہو جسے کتاب و سنت میں بیان کیا گیا ہے، اور احکام کی تنفیذ کی صلاحیت ہو۔)

فقہاء نے قضاۃ کی تقرری کے لیے جو شرائط متعین کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:[3]

I. دینی معیارات

- مسلمان ہو۔
- متقی ہو۔
- عام لوگوں میں اس کی شہرت اچھی ہو کہ وہ مذہب پر پوری طرح عمل پیرا ہے۔

II. علمی معیارات

- قاضی احکامِ شریعت کا عالم ہو۔

---

[1] النساء:58

[2] عبدالوهاب خلاف، السلطات الثلاث في الإسلام (قاهره، دارآفاق 2006ء) 95

[3] فتحی الدرینی،خصائص التشريع الإسلامي في السياسة والحكم، 103-107

- لکھنا جانتا ہو۔
- سابقہ قضاۃ کے فیصلوں کا علم رکھتا ہو۔
- علاقائی زبان پر عبور حاصل ہو۔

III. جسمانی معیارات

- قاضی سلیم الحواس ہو۔
- بالغ اور عاقل ہو۔

IV. اخلاقی معیارات

- حکمت و دانائی کا حامل ہو۔
- صبر والا ہو۔
- مشاورت کرتا ہو۔

(2) آزادانہ سماعت کا حق:

اسلام میں قاضی کو یہ حق دیا گیا کہ وہ آزادانہ سماعت کر سکے۔ اس کے لیے اگرچہ ضروری ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے لیکن اس فیصلے میں وہ مکمل طور پہ آزاد ہوتا ہے۔ اسی طرح فیصلے سے قبل سماعت کے لیے بھی اسے جو تحقیق یا وقت درکار ہے یہ اس کا حق ہے اور اس پر دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا ہے کہ وہ اتنے وقت میں یا اس نوعیت کا فیصلہ سنائے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے انہیں یمن قاضی بنا کر روانہ کیا

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُعَاذًا إِلَى اليَمَنِ، فَقَالَ: «كَيْفَ تَقْضِي؟»، فَقَالَ: أَقْضِي بِمَا فِي كِتَابِ اللَّهِ، قَالَ: «فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِي كِتَابِ اللَّهِ؟»، قَالَ: فَبِسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ:

«فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟»، قَالَ: أَجْتَهِدُ رَأْيِي، قَالَ:الحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللَّهِ))[1]

(کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن میں مبعوث فرمایا، اور فرمایا آپ کیسے فیصلہ کریں گے؟ انہوں نے جواب دیا اللہ کی کتاب سے، اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو؟ انہوں نے جواب دیا کہ سنتِ رسول سے، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر سنت رسول سے پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو توفیق بخشی۔)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح رحمہ اللہ کو خط میں لکھا تھا:

((عَنْ شُرَيْحٍ أَنَّهُ كَتَبَ إِلَى عُمَرَ يَسْأَلُهُ، فَكَتَبَ إِلَيْهِ، «أَنْ اقْضِ بِمَا فِي كِتَابِ اللَّهِ، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَبِسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِي كِتَابِ اللَّهِ، وَلَا فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَاقْضِ بِمَا قَضَى بِهِ الصَّالِحُونَ، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِي كِتَابِ اللَّهِ، وَلَا فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَمْ يَقْضِ بِهِ الصَّالِحُونَ، فَإِنْ شِئْتَ فَتَقَدَّمْ، وَإِنْ شِئْتَ فَتَأَخَّرْ، وَلَا أَرَى التَّأَخُّرَ إِلَّا خَيْرًا لَكَ، وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ))[2]

(شریح رحمۃ اللہ سے روایات ہے کہ انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ پوچھنے کے لیے ایک خط لکھا تو عمر رضی اللہ عنہ نے (جواب) لکھا: فیصلہ کرو اس کے مطابق جو کتاب اللہ میں ہے، اگر وہ کتاب اللہ میں نہ ہو تو سنت رسول ﷺ کے مطابق، اور اگر وہ نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنت رسول ﷺ میں تو اس کے مطابق فیصلہ کرو جو نیک لوگوں نے کیا تھا، اور اگر وہ نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنت رسول ﷺ میں اور نہ ہی نیک لوگوں کا کوئی فیصلہ ہو تو اگر تم چاہو تو آگے بڑھو (اجتہاد کرو) اور اگر چاہو تو پیچھے رہو (فیصلہ نہ کرو) اور میں پیچھے رہنے ہی کو تمہارے حق میں بہتر سمجھتا ہوں۔ والسلام علیکم۔)

---

[1] ترمذی، محمدبن عیسی، سنن ترمذی، باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی، ح:1327

[2] نسائی، احمد بن شعیب، سنن النسائی، باب الحکم باتفاق اهل العلم، ح:5401، صحیح الاسناد

ان دونوں احادیث کے مطالعہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ قاضی اپنے فیصلے میں خلیفہ کی رائے کا پابند نہیں ہے۔ اس پر صرف یہ لازم ہے کہ وہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے فیصلہ کرے۔ اسلامی تاریخ میں قضاۃ کے مشورہ کرنے کی مثالیں موجود ہیں۔ اگر قاضی چاہے تو علماء وماہرین سے مشورہ کر سکتا ہے اور ضرورت ہو تو مشاورتی کمیٹی بھی تشکیل دے سکتا لیکن فیصلہ سنانے میں وہ آزاد ہے۔

(3) معاشرتی عزت ووقار اور مراعات کا حق:

قاضی کا مرتبہ معاشرے میں بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے منصب پر فائز ہوتا ہے جس کا تعلق عوام کی بہبود وفلاح کے ساتھ ان کے تنازعات کے منصفانہ حل کے ساتھ ہوتا ہے اور لوگوں کے مابین جب باہمی سطح پر معاملات حل نہیں ہو پاتے تو وہ اس منصب کی طرف دیکھتے ہیں کہ انہیں یہاں سے انصاف ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا غیر جانبدار ہونا ضروری ہوتا ہے اور اسے اپنے اعمال وافعال میں نہایت محتاط ہونا چاہیے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ قاضی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خود خرید وفروخت کرے۔ کیونکہ وہ جب ایسا کرے گا تو لوگ قاضی ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ رعایت کا معاملہ کریں گے اور پھر جب ان لوگوں کا کوئی فیصلہ عدالت میں آئے گا تو وہ قاضی بھی ان کے ساتھ تعاون کرنے کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔

بعض فقہاء نے قاضی کی طرف سے ایسے کام کرنے کو جائز قرار دیا ہے جو براہ راست تجارت نہ ہوں جیسے فارغ اوقات میں کسی دوسرے پیشے کو اختیار کرنا لیکن اس ضمن میں ترجیح اسی قول کو ہے کہ قاضی کو قضاء کے علاوہ کسی اور پیشے سے وابستہ نہیں ہونا چاہیے۔ چاہے وہ جو بھی پیشہ کیوں نہ ہو۔ لیکن اس پر بھی زور دیا گیا ہے کہ حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قضاۃ کے لیے اتنی تنخواہ ومراعات ضرور مہیا کرے جس سے ان کی تمام ضروریات پوری ہو جائیں اور ان کا وقار بحال رہے[1]۔

قاضی کی تنخواہ کے حوالے سے فقہاء نے رزق القاضی کے عنوان کے تحت بہت تفصیل کے ساتھ بات کی ہے۔ بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ اگر قاضی امیر اور دولت مند ہو تو اسے بیت المال سے کچھ نہیں لینا چاہیے۔ البتہ فقہاء قاضی کی تنخواہ ومراعات کے بارے میں جو گفتگو کرتے ہیں اس کا محور یہ ہے کہ قاضی کی زندگی عزت ووقار کے ساتھ گزرنی

[1] الکاسانی، ابوبکربن مسعود،بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع(بیروت، دارالکتب العلمیہ،1985ء) 37/9

چاہیے۔ فقہ میں یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ قاضیوں کے لیے تحائف کا لینا درست نہیں ہے۔ اگرچہ اصل میں تو قاضی کے لیے تحفے کا لینا ناجائز نہیں ہے لیکن کراہت کی وجہ فساد کا خوف ہے کہ ان تحائف کے اثرات قاضی کے عدالتی فیصلوں پر پڑ سکتے ہیں اس لیے بہتر یہ ہے کہ قاضی تحفے قبول نہ کریں۔

ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ نے ہدیہ واپس کیا تو انہیں کہا گیا کہ آنحضرت ﷺ تو ہدایا قبول کرتے تھے۔ اس پر آپ نے جوب دیا کہ آنحضرت ﷺ کے لیے یہ ہدایا تھے لیکن ہمارے لیے یہ رشوت ہیں۔ آنحضرت ﷺ تو ہدیہ کے ذریعے لوگوں کو قریب کرتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ نبی اور معصوم تھے لیکن ہم ان خطرات سے محفوظ نہیں ہوسکتے جو ہدایا کی وجہ سے ہوسکتے ہیں۔[1]

(4) قاضی کے فیصلے کا تحفظ:

قاضی جب ایسے معاملات میں کوئی فیصلہ کرتا ہے جن میں واضح نص موجود نہیں ہوتی تو وہ اجتہاد سے کام لیتا ہے اور جب کوئی فیصلہ اجتہاد کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اس میں غلطی کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ قاضی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مسائل سنے ان میں غور وخوض کرے اور پھر حق کے ساتھ فیصلہ سنادے۔ جب قاضی کوئی فیصلہ سنادے تو اس کا فیصلہ لاگو ہوگا اور اسے مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا-﴾[2]

(آپ کے رب کی قسم وہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتے کہ جب تک وہ آپ کو اپنے تنازعات میں فیصل نہ تسلیم کرلیں، پھر وہ اپنے اندر اس فیصلے کو تسلیم کرنے میں کوئی خلجان نہ رکھیں۔)

مفسرین اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ قضاۃ کے فیصلوں کو تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے جب تک کہ فیصلے کے بارے میں کوئی واضح شبہ یا ایسا ثبوت موجود نہ ہو جو اس کی صحت پر سوالیہ نشان پیدا کرے۔[3]

---

[1] ابن تیمیہ، احمد بن عبدالحلیم،السیاسہ الشرعیہ، 191

[2] النساء:65

[3] شوكت عليان، السلطة القضائية في الإسلام (قاهره، دارالرشيد، 2015ء) 134

فقہاء کی رائے کہ قاضی کے فیصلوں کو خوشدلی کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے، نہ تو اس پر لعن طعن کی اجازت ہے اور نہ اسے مسترد کرنے کی۔ ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قاضی کے فیصلے کو تحفظ فراہم کرے اور لاگو قرار دے۔ اسی لیے فقہ میں قاضی کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ کہ اگر کوئی شخص عدالتی معاملات میں خلل ڈالنے کی کوشش کرے، یا کوئی فریق سماعت میں مشکلات پیدا کرے، قاضی سے بدتہذیبی سے پیش آئے یا ایسی بات کرے جس سے عدلیہ کا احترام مجروح ہوتا ہو، یا رشوت کی بات کرے تو قاضی اس کے خلاف تادیبی کاروائی کر سکتا ہے اور حتی کہ اسے قید کی سزا بھی دی اسکتی ہے۔[1]

(5) قضاۃ کی معزولی کا معاملہ:

قضاۃ کی معزولی کے حوالے سے بھی فقہاء نے کلام کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اگر قضاۃ کو آسانی کے ساتھ معزول کیا جاسکے گا تو اس کا نقصان عدلیہ اور اس کی کارکردگی کو بھی پہنچے گا۔ اس سے انتظامیہ اور عدلیہ کے مابین بھی عدم اعتماد اور چپقلش کا ماحول بنا رہے گا کیونکہ قضاۃ کو اپنے ہر فیصلے کے وقت اپنی ملازمت کا خدشہ بھی حاوی رہے گا کہ انہیں اس کی وجہ سے معزول نہ کر دیا جائے۔ اسلام میں جہاں قاضی کی تقرری کے لیے شرائط معین کی گئی ہیں وہیں اس کی معزولی اور تنزلی کے بارے میں بھی واضح احکامات دیے گئے ہیں تاکہ عدلیہ کے امور کو استحکام حاصل رہے۔ شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ اگر قاضی درست کام کر رہا ہو اور اسے ہٹانے میں کوئی کھلی مصلحت عامہ نہ ہو اس وقت تک اسے معزول نہیں کیا جاسکتا کیونکہ قاضی کی تقرری باقاعدہ ایک معاہدہ ہوتا ہے اور اس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی[2]۔

ارشادِ باری تعالی ہے:

﴿أَوْفُوا بِالْعُقُودِ-﴾[3]

(اور اپنے معاہدوں کی پاسداری کرو)

---

[1] الکاسانی، ابوبکربن مسعود،بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع148/9

[2] ایضا

[3] المائدہ: 1

چونکہ قاضی کی تقرری اور اس کے عمل میں عام مسلمانوں کی بھلائی مضمر ہے اس لیے بلاوجہ اسے عہدے سے برخاست نہیں کیا جاسکتا۔

جبکہ احناف اور بعض حنابلہ کا قول ہے کہ قاضی کو معزول کیا جاسکتا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ جس طرح امام وخلیفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے افراد کو معزول یا برخاست کر سکتا ہے اسی طرح وہ قضاۃ کو بھی ان کے عہدے سے معزول کر سکتا ہے۔ البتہ وہ بھی یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ یہ اختیار مکمل طور پہ صوابدیی نہیں ہے اس کے لیے کوئی معقول سبب موجود ہونا چاہیے، جس طرح کہ کسی بھی شخص کو اس کے کام سے ہٹانے کے لیے کوئی سبب ہونا چاہیے، مثال کے طور پہ اگر اس سے بہتر وباصلاحیت قاضی مل جائے تو اسے معزول کیا جاسکتا ہے۔ فقہاء نے یہ بھی تصریح کی ہے اگر ایک خلیفہ نے قاضی کا تقرر کیا اور اس کے بعد خلیفہ کو اپنے منصب سے ہٹا دیا گیا یا وہ وفات پا گیا تو ایسی کسی صورت میں قاضی کی تقرری پر اثر نہیں پڑے گا، قاضی بہر صورت اپنے معاہدے کے مطابق کام کرتا رہے گا۔ کیونکہ قاضی کی معطلی سے عدل کا نظام متاثر ہوتا ہے جو کہ مصلحت عامہ کے خلاف ہے۔[1]

عصر حاضر میں عام طور پہ پہلی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے اور قاضی کو بلاوجہ معزول نہیں کیا جاسکتا۔ حکومتوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ وہ قاضی کو اس کے عہدے سے ہٹا دیں۔

قاضی ابو حامد بغداد کے قاضی تھے انہوں نے ایک مرتبہ گورنر کو خط میں لکھا کہ:

"اعلم أنك لست بقادر على عزلي عن ولايتي التي ولانيها الله تعالى، وأنا أقدر أن أكتب رقعة إلى خراسان بكلمتين أو ثلاث أعزلك عن خلافتك-"[2]

(آپ علم ہونا چاہیے کہ آپ مجھے اس عہدے سے ہٹانے پر قادر نہیں ہیں جو اللہ تعالی نے مجھے عطا کیا ہے، البتہ میں اگر خراسان کی جانب دو تین جملے لکھوں تو آپ کو معزول کیا جاسکتا ہے۔)

[1] احمد بن محمد الزرقاء، شرح القواعد الفقهية(بيروت، دارالشروق، 2011ء) /173

[2] ابن قيم الجوزيه،محمد بن ابوبكر،الطرق الحكميه، 66

مروج قوانین کے ساتھ تقابلی جائزہ:

اسلام کے عدالتی تحفظ کے تصور کو سامنے رکھتے ہوئے عدلیہ اور ججز کے معاملات میں ذکر کردہ دونوں نقطہ نظر کے پس منظر میں جو تقابلی جائزہ سامنے آیا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

- اسلام میں عدالت کا تصور چونکہ شرعی ہے اس لیے دینی روایت میں عدلیہ کے فیصلے شرعی اصولوں کے تحت ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت میں ایک گونہ تقدس موجود ہوتا ہے، جبکہ مروج قوانین میں عدالتی فیصلے اگرچہ محفوظ تصور ہوتے ہیں لیکن وہ شرعی نہیں کہلاتے اس لیے ان میں تقدس کا وہ عنصر نہیں ہوتا تو جو ایک اسلامی روایت کے تحت عدلیہ کے تصور میں ہوتا ہے۔
- شرعی عدالتوں میں مآخذ قرآن وسنت اور فقہی اجتہادات ہوتے ہیں جبکہ مروج قوانین تحت تشکیل پانے والی عدالتوں میں ضروری نہیں کہ مآخذ شرعی ہی ہوں بلکہ ان میں شہری قوانین کے تصور کے تحت اصولوں وضع کیے جاتے ہیں جو انسانی کاوش کہلاتے ہیں۔
- شرعی حوالے سے عدالتی معاملات میں کوئی تغیر کا امکان نہیں ہے۔ جبکہ مروج قوانین حتمی اور غیر متبدل نہیں ہوتے، ان میں وقت وحالات کے اعتبار سے تبدیلی متوقع ہوسکتی ہے۔
- مروج قوانین کے تحت عموماً عدالتیں شہری معاملات میں فیصلہ کرنے کی پابند ہوتی ہیں۔ جبکہ شرعی عدالتوں میں ایمان کے امور سے لے کر تمام معاملات میں فیصلہ دینے کا اختیار ہوتا ہے اور اس کا دائرہ عمل تمام شعبوں میں مساوی حیثیت کا ہوتا ہے۔
- شرعی عدالتوں میں عام طور پہ حلال وحرام کے ضمن میں فیصلہ سنایا جاتا ہے جبکہ مروج عدالتوں میں قانونی شہری مظہر کا غلبہ ہوتا ہے جس میں حلال حرام کی اصطلاحات استعمال نہیں ہوتیں۔ اگرچہ بعض مسلم ممالک میں الگ سے شرعی عدالتیں بھی موجود ہیں جو عوامی نوعیت کی ہیں لوگوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ان عدالتوں سے بھی رجوع کرسکتے ہیں۔

ماہرین کے مطابق ایک مسئلے میں شرعی عدالتیں ایک فیصلہ صادر کرتی ہیں تو اس کے برخلاف کامن لاء کی عدالتوں کے مروجہ قوانین کچھ اور کہتے ہیں۔ لہذا یہ اختلاف لوگوں کے اندر ابہام کو پیدا کرتا ہے اور مختلف لوگ اپنے اپنے

مفادات کے پیش نظر مقدمات کا حل چاہتے ہیں۔ ایسے مواقع پر عدل وانصاف کی فراہمی اور شفافیت کے مسئلے میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔

جیسا کہ ملائیشیا میں عدالتیں دو طرح کی ہیں۔ ایک قسم کی عدالتیں وہ ہیں جنہیں کامن لاء کورٹس کہا جاتا ہے، وہاں عام سماجی مسائل کے مقدمات نمٹائے جاتے ہیں۔ جبکہ دوسری قسم شرعی عدالتوں کی ہے جہاں ریاست کی جانب سے لوگوں کے مذہبی امور سے متعلقہ مقدمات ومسائل کو سنا اور انہیں حل کیا جاتا ہے۔

ملائیشیا اور پاکستان دونوں ممالک میں مذہب کی عملداری میں کئی سطح پر اختلافات کے باوجود یہ چیز مشترک ہے کہ دونوں کے آئین میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ملک میں کوئی قانون اسلام کے مخالف نہیں بنایا جائے گا۔ پاکستانی آئین کے آرٹیکل 2 اور ملائیشین آئین کے آرٹیکل 3 کے درمیان ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اسلام مخالف قوانین کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ آئین میں دی گئی یہ وضاحت اس امر کی غماز ہے ان ممالک میں جمہوریت کا نظم عین ویسا نہیں ہوگا جیسا کہ مغربی ممالک میں ہے۔ لیکن اس مشترک امر کے باوجود یہ فرق موجود ہے کہ پاکستان میں عدالتی نظام کسی نظریاتی لیبل کے ساتھ کام نہیں کرتا۔ یہاں عدالتوں کی وہ تقسیم موجود نہیں ہے جو ملائیشیا میں ہے کہ سیکولرزم اور شرعی عدالتیں دو متوازی نظام ہائے انصاف کے ڈھانچے موجود ہیں۔ البتہ پاکستان میں وفاقی شرعی عدالت وجود رکھتی ہے، مگر اس کی نوعیت وہ نہیں ہے جو ملائیشیا کی عدالتوں کی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت دیگر عام عدالتوں کی طرح نہیں ہے جہاں لوگ اپنے مقدمات ومسائل کے حل کے لیے پیش ہو سکیں۔ بلاشبہ پاکستان کے آئین میں یہ بات کہی گئی ہے کہ کوئی قانون شریعت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا، اس چیز کا دھیان تو رکھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود عدالتوں کو شرعی عدالتیں نہیں کہا جاتا اور نہ لوگ نظریاتی شناخت کی طرف توجہ دیتے ہیں[1]۔

[1]Costituting Religion: Islam Libral Rights and the Malaysian State, https://sahsol.lums.edu.pk/law-journal/constituting-religion-islam-liberal-rights-and-malaysian-state-book-review

پاکستانی تناظر:

اسلام کے عدالتی تحفظ کے تصور کے مظاہر کی وضاحت سے جو نتائج سامنے آئے ہیں انہیں سامنے رکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ ان مظاہر کے تناظر میں پاکستانی مروج قوانین اور اسلام کے عدالتی تحفظ کے حوالے کئی مشترکات ہیں اور کچھ اختلافات ہیں۔

مشترکات:

- دونوں قوانین کے تحت ججز کے فیصلوں کو ریاست کی جانب سے مکمل حمایت حاصل ہوتی ہے۔
- ججز پر ان کے فیصلوں کے خلاف مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا۔
- اجتہادی اور غیر عمداً ہونے والی خطا کی وجہ سے ججز پر ہتک عزت یا نقصان کے ازالے کا کوئی اقدام نہیں کیا جاسکتا۔
- ججز کو بلاوجہ معزول نہیں کیا جاسکتا، البتہ اگر کوئی شبہ ظاہر ہو تو قواعد کے تحت ان کے خلاف کاروائی کرتے ہوئے عہدے سے برخاست کیا جائے گا۔
- توہینِ عدالت کا تصور دونوں قوانین میں موجود ہے۔
- ججز کی عزت و وقار اور مراعاتِ حیات کے حق کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔
- عدالتوں کی جانب سے جو بھی فیصلے کیے جائیں انہیں ہو بہو لاگو سمجھا جائے گا اور ریاست و سماج کی ذمہ داری ہے کہ انہیں تسلیم کریں۔ ان امور کی تنفیذ کے راستے میں حائل کی جانے والی تمام رکاوٹیں جرم متصور ہوں گی اور ان میں ملوث افراد یا اداروں کے خلاف کاروائی عمل میں لائی جائے گی۔
- ہر ایسا امر جو عدالتی فیصلے کی شفافیت پر بلاثبوت شبہ محسوس ہو وہ جرم خیال کیا جائے گا۔ مثال کے طور پہ صراحتاً یا اشارتاً عدلیہ کے کسی فیصلے کو تسلیم نہ کرنا یا اس کے درست ہونے سے انکار کرنا۔ توہین عدالت کے ضمن میں اس کے مرتکب شخص پر مقدمہ دائر کیا جاسکتا ہے۔
- عدالت میں دولت یا رتبے کا متکبرانہ اظہار کرنا ممنوع ہے۔
- مقررہ تاریخوں پر بلاوجہ حاضری نہ دینا توہین کے زمرے میں آئے گا۔

البتہ پاکستانی قوانین کے مطابق بعض امور ایسے ہیں جو توہین یا جرم متصور نہیں ہوں گے:[1]

- عدالتی معاملات سے متعلق ایسی تنقید جو مثبت اور مہذب الفاظ میں کی جائے۔
- عدالتی فیصلوں میں تاخیر پر تنقید کرنا، جس میں ججز کی نیت پر شک کا اظہار نہ ہو۔
- اخبارات یا عدالت کے احاطوں میں عدالتی کاروائی کی شکایات سے متعلق مثبت اور مہذب انداز میں تنقید کا اظہار۔
- ادب واحترام کے دائرے میں رہتے ہوئے کسی مقدمے میں ججز کے ساتھ بحث ومباحثہ کرنا۔

اسلامی روایت کے ساتھ موزانے کے حوالے سے بعض امور میں شرائط و قواعد کے حوالے سے کچھ اختلافات ہیں جو درج ذیل ہیں:

اختلافات

(1) قضاۃ کے عقیدے کا مسئلہ:

اسلام کے عدالتی تحفظ کے تصور میں قضاۃ کے عقیدے کو اہمیت دی گئی ہے کہ وہ مسلمان ہونا چاہیے، جبکہ عام مروج قوانین میں بشمول پاکستان یہ شرط لاگو نہیں کی گئی کہ جج مسلمان ہی ہو، بلکہ غیر مسلم بھی جج بن سکتے ہیں۔

(2) قضاۃ کی جنس

کلاسیکی فقہی قوانین کے تحت یہ ضروری ہے کہ قضاۃ مرد ہوں، جبکہ پاکستان سمیت تمام قومی ریاستوں کے مروج قوانین میں یہ جنس کی شرط لاگو نہیں کی گئی ہے۔ان کے مطابق خواتین بھی جج بن سکتی ہیں۔[2]

(3) عدلیہ کے عزوت ووقار کے مسئلہ میں بنیادی نکتے پر اتفاق ہے، لیکن اسلام میں باوجود احترام کے یہ بطور ادارہ احتساب سے بالاتر نہیں ہے۔

(4) ججز کے لیے خصوصی رعایات کی فراہمی کی گی ہے۔ البتہ اسلام میں ججز بالکلیہ جوابدہی سے ماورا نہیں۔ نہ فیصلوں میں اور نہ انتظامی امور کے حوالے سے۔

(5) حکمرانوں کے احتساب کے مسئلہ میں اسلامی روایت کوئی مراعات نہیں فراہم کرتی، نہ فقہاء نے اس بابت کوئی رعایات دی ہیں۔

---

[1]Ghulam Murtaza Azad, "Qualifications of a Qadi", *Islamic Studies* 23:3 (1984), 249-250.
[2]Ibid

اسلامی روایت قضاۃ کی تقرری کے حوالے سے جن امور کی رعایت اہم ہے ان کی تفصیل گزر چکی ہے، جبکہ پاکستانی مروج قوانین میں قضاۃ کی تقرری اور ان کی اہلیت کے لیے جو شرائط متعین کی گئی ہیں وہ درج ذیل ہیں:[1]

پاکستانی مروج قوانین میں قضاۃ کی تقرری ان کی اہلیت و شرائط:

- قاضی پاکستانی شہری ہو، چاہے وہ شہریت اصل ہو یا پھر حاصل کی گئی ہو۔
- تعلیمی کوائف مکمل ہوں۔
- اس کی عمر اٹھارہ سال سے کم نہ ہو۔
- ضلعی عدالتوں میں تقرری کے لیے اس کا اپنے شعبے میں پانچ سال کا تجربہ ہو۔
- اعلی عدالتوں میں تعیناتی کے لیے کم از کم پندرہ سال کا تجربہ ہو۔

اس بحث کو سامنے رکھتے ہوئے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں عدالتی تحفظ کا تصور موجود ہے اور بہت سے امور میں پاکستان کے مروج قوانین میں اس کی مماثلت بھی موجود ہے البتہ جن چیزوں میں فرق ہے ان میں سے یہ امور نمایاں ہیں۔

عدالتی عزت و وقار کے حوالے سے پاکستان میں جو قوانین وضع کیے گئے ہیں ان کے مطابق امور جرم متصور ہوں گے، اور اسلامی روایت کے تناظر میں بھی انہیں ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور اس پر سزا ہو سکتی ہے۔

[1]Sarkar Ali Akkas, "Bond Law Review", Appointment Of Judges: A Key Issue Of JudicialIndependence,epublications.bond.edu.au/cgi/viewcontent.cgi?Article=1293&context=blr (assessed 4th of February, 2017).

خلاصہ

عدالتی استثناء کا مسئلہ قانونی لحاظ سے ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری دنیا میں بحث ہوتی رہتی ہے۔ تاہم عام طور پہ اس بحث کی جہت شہریت اور قومی ریاست کے مفادات کے تناظر میں ہوتی ہے۔ مذہبی حوالے سے عدالتی استثناء کے قوانین بہت کم زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ پاکستان چونکہ ایک اسلامی ملک ہے اور اس کے آئین 227 میں یہ درج ہے کہ ملک کے اندر کوئی بھی قانون خلاف شریعت نہیں وضع کیا جائے گا اس لیے اس بات کی شدید حاجت تھی کہ اس مسئلے پر دینی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے مفصل بات کی جائے۔ بالخصوص جب پاکستان کے اندر عدالتی استثناء کے قوانین کا نوآبادیاتی عہد کے ہوں تو ایسے میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ موضوع پر تفصیلی گفتگو کی جائے۔

عام طور پہ دیکھا گیا ہے کہ عدالتی استثناء کی بحث زیادہ تر حکمرانوں کے حوالے سے کی جاتی ہے کہ صدور اور گورنرز کو جو استثناء حاصل ہوتا ہے اس کی حیثیت کیا ہے۔ جبکہ اس کا دوسرا اہم پہلو عدلیہ کے ساتھ بھی متعلق ہے کہ ججز کو جو رعایات و مراعات دی جاتی ہیں چاہیے قضاء سے متعلقہ ہوں یا انتظامی نوعیت کی، ان میں شریعت کی رائے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ لہذا اس بات کی حاجت تھی کہ ان دونوں پہلوؤں سے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔

اس مقالے کے اندر بنیادی طور پہ جن مباحث پر بات کی گئی ہے وہ نظری نوعیت کی نہیں ہیں کہ عدالتی استثناء کے بارے میں شرعی نقطہ نظر کیا ہے۔ بلکہ عملی لحاظ سے پاکستان کے قوانین کی روشنی میں موضوع کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے اندر کئی مقدامات کے حوالے بھی ہیں تاکہ اس موضوع پر ہونے ہوالی پیش رفت اور اس کے مضمرات پر روشنی ڈالی جاسکے۔

مقالے کے اندر جو نتائج سامنے آئے وہ اس طرح کے نہیں ہیں عدالتی استثناء کے تصور کو بالکلیہ مسترد کر دیا جائے۔ بلکہ اسلام کا نقطہ نظر مساوات پر مبنی ہے اور اسی کے تناظر میں نتائج سامنے آئے ہیں۔ اگرچہ حکمرانوں کے عدالتی استثناء کے بارے میں اسلام کی دوٹوک رائے یہ ہے کہ یہ عدم مساوات پر مبنی اور اس کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ اسلام بھی ججز کو بعض رعایات و مراعات دیتا ہے جن کی تفصیل مقالے میں دی گئی ہے۔ البتہ بعض امور ایسے ہیں جن کی اسلام مخالف کرتا ہے۔

اسی طرح ججز کے بر خلاف حکام کے لیے فراہم کیے گئے مروج عدالتی استثناء کو دین اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ شرعی نقطہ نظر سے حکام اور عام لوگ برابر ہیں۔ ان پر مقدمہ بھی دائر کیا جاسکتا ہے اور مدت حکومت کے دوران ان کو عدالت میں پیش ہونے کا استثناء بھی حاصل نہیں ہوتا۔

پاکستان میں عدالتی استثناء کے قوانین پر نظر ثانی کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں بعض امور ایسے بھی ہیں جو اسلامی تعلیمات کے بر خلاف ہیں بلکہ کئی مغربی قومی ریاستوں کے ساتھ موازنے میں بھی یہ زیادہ عدم مساوات پر مبنی ہیں۔

نتائج مقالہ

اس تحقیق سے حاصل شدہ اہم نتائج درج ذیل ہیں:

پاکستان میں عدالتی استثناء کا قانون نو آبادیاتی عہد کا ہے

پاکستان چونکہ ایک اسلامی ملک ہے اور اس کے آئین 227 میں یہ درج ہے کہ ملک کے اندر کوئی بھی قانون خلاف شریعت نہیں وضع کیا جائے گا

مروج استثناء باقاعدہ آئین میں درج ہے۔ اس کے آرٹیکل 248 کی شقوں (1 سے 4) میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔

اسی طرح آئین پاکستان میں کے آرٹیکل 199 میں ججز کے لیے بھی عدالتی استثناء کا قانون موجود ہے۔

تعزرات پاکستان کے دفعہ 77 جج کے فیصلے کو غلط یا نقصان دہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

صدر کو آرٹیکل 45 کے تحت سزا معاف کرنے یا تبدیل کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے۔

عدالتی تحفظ کا فقہی قانون استقلالِ قضاء اور سفیروں کی حیثیت کے متعلق ہے۔

اسلامی قانون اور آئین پاکستان میں قضاۃ کو بلاوجہ معزول نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام میں حکمرانوں کے لیے عدالتی استثناء کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

سفارشاتِ مقالہ

محققین کو درج ذیل اُمور پر کام کرنے کی ضرورت ہے:

- قوانین پاکستان کے مطابق جو غیر اسلامی دفعات کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے۔
- عدالتی اصلاحات پر جو کہ عدل وانصاف اور مساوات کے اصولوں سامنے رکھتے ہوئے کی جائیں۔

فہرست آیات

نمبر شمار	آیات	سورۃ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
1	إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا'-	النساء	58	99
2	وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوابِالْعَدْلِ	النساء	58	12
3	وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ	النساء	58	16
4	وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ	النساء	58	78
5	فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَايَجِدُوافِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًامِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا	النساء	65	101
6	يَاأَيُّهَاالَّذِينَ آمَنُواكُونُواقَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَلِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِالْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ	النساء	135	18
7	أَوْفُوا بِالْعُقُودِ	المائدہ	1	102
8	وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ	النور	55	79
9	وَقُلْ ءَامَنتُ بِمَآ نَزَلَ ٱللَّهُ مِن كتٰبٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ.	الشوری	15	16
10	لَقَدْ أَرْسَلْنَارُسُلَنَابِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔	الحدید	25	16

فہرست آحادیث

نمبر شمار	احادیث کا متن	کتاب کا نام	صفحہ نمبر
1	إِيَّاكَ وَالظُّلْمَ، فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	صحیح بخاری	17
2	أَلاَ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ...	سنن ابی داود	19
3	إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ، أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ...	صحیح بخاری	80
4	إِذَا حَكَمَ الحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ...	صحیح بخاری	80
	بَعَثَ أَبَا جَهْمِ بْنَ حُذَيْفَةَ مُصَدِّقًا فَلَاجَّهُ رَجُلٌ فِي صَدَقَتِهِ---	سنن ابی داود	29
5	كَيْفَ تَقْضِي؟ فَقَالَ: أَقْضِي بِمَا فِي كِتَابِ اللَّهِ...	جامع ترمذی	98
6	الْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ: وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ، وَاثْنَانِ فِي النَّارِ ...	سنن ابی داود	80
7	أَنَّهُ كَتَبَ إِلَى عُمَرَ يَسْأَلُهُ، فَكَتَبَ إِلَيْهِ،أَنْ اقْضِ بِمَا فِي كِتَابِ اللَّهِ...	سنن النسائی	99
8	يَقْسِمُ قَسْمًا أَقْبَلَ رَجُلٌ فَأَكَبَّ عَلَيْهِ، فَطَعَنَهُ...	سنن ابی داود	28
9	يَا عِبَادِي، إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ...	صحیح مسلم	17
10	يَا أَيُّهاالنَّاسُ! اَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى أَعْجَمِيٍّ ...	مسند احمد	81

فہرست حوالہ جات

القرآن الحکیم

کتب احادیث:

1. البخاری محمد بن اسماعیل ،الجامع الصحیح (قاهره:دارالمنهاج،2002ء)
2. ترمذی محمد بن عیسی ،سنن ترمذی(بیروت:دارالتراث،2009ء)
3. ابن حنبل،احمد بن حنبل ،مسند احمد(ریاض:دارالسلام،1999ء)
4. السجستانی ابوداود،سلمان بن الاشعث، سنن ابوداود(انقره:دارانقره للکتب،2005ء)
5. القشیری مسلم بن جحاج، الجامع الصحیح(بیروت:مکتبة العلمیة ،1994ء)
6. نسائی،احمد بن شعیب،سنن نسائی(بیروت: دارالتراث،2009ء)

عربی کتب:

1. ابوفارس،القضاء في الإسلام(اردن:مکتبة الاقصی،2004ء)
2. احمدلطفی ،سید ،السیاسه الدارالقومیه(لبنان: للطباعه والنشر،2011ء)
3. اسامه السهلی،المحکمة الجنائیة الدولیة(لبنان:دارالتراث،2018ء)
4. بشارة أحمد موسی،المسؤولیة الجنائیة الدولیة للفرد،(الجزائر:دار هومه للطباعة والنشر والتوزیع2009)
5. بیضاوی عبدالله بن عمر،البیضاوی(بیروت:دارالکتب العلمیة 1998)
6. ابن تیمیه، احمد بن عبدالحلیم،السیاسه الشرعیه(ریاض:دارالسلام،1999ء)
7. ابن اثیر، علی بن محمد، الکامل فی التاریخ(بیروت:دارالکتاب العربی 1997ء)
8. جمال مرسی بدر،مسؤلیه الموظفین ومسؤلیةالدوله(اسکندریه:دارالمطبوعات الجامعی،2004ء)
9. رازی،فخر الدین، مفاتیح الغیب(بیروت:دارلفکر1415ھ)
10. رازی،محمد بن عبدالقادر، مختار الصحاح (لبنان:مکتبة 2008ء)
11. رحاب شادیه، الحصانة القضائیة(بیروت:دارالمنهل،2001ء)
12. زید مصطفی، المصلحه فی التشریع الاسلامی (قاهره:دارانماء،1989ء)
13. زرقاء،احمد بن محمد،شرح القواعد الفقهیة (بیروت:دارالشروق،2011ء)
14. سعود بن سعد،التنظیم القضائي في المملکة العربیة السعودیة(ریاض: دارالنشور،2018ء)

15. سكاكني،العدالةالجنائيةالدوليةودورهافيحمايةحقوقالإنسان،(الجزائر:دارهومه،للنشر، 2018ء)
16. الشامي حسين علي، الدبلوماسية(اردن:دار الثقافة للنشر و التوزيع،2005)
17. الشامی ابن عابدين، محمد بن امين،تكملہ ردالمختار(لبنان:مكتبة نشور،2017ء)،
18. الشامی،ابن قدامة عبدالله بن احمد، روضة الناظر (بيروت: درالعاصمة ،2001ء)
19. ششتاوي سمير,المسؤولية الجنائية لضباط الشرطة عن قتل المتظاهرين(قاهره:الطبعة،الأولى، المكتب الجامعي الحديث2000ء)
20. شوكت عليان، السلطة القضائية في الإسلام (قاهره:دارالرشيد2015ء)
21. صغيرعبدالعزيز،الضمانات الدستورية للمواطنين(قاهره:المركز القومي للإصدارات،القانونية)
22. عائشہ راتب، التنظيم الدستورى (قاهره:دارالنهضہ، 1990ء)
23. عبداللطيف الانصارى،سوسيولوجيا الأزمه (بيروت:المؤسسہ العربيہ،2000ء)
24. عبدالوهاب خلاف، السلطات الثلاث في الإسلام (قاهره:دارآفاق 2006ء)
25. عتوم محمد الشبلي، اتفاقيات الحصانة (اردن:دار وائل للنشر والتوزيع، 2013ء)
26. عطيہ مشرفہ، القضاء فى الاسلام (قاهره: دارالصدوق، 2004ء)
27. ابن العربى، ابوبكر محمد بن عبدالله، احكام القرآن(بيروت:دارالمعرفه، 1972ء)،
28. على طنطاوى، اخبار عمر(دمشق:دارالمناره،2004ء)
29. فتحى الدرينى، خصائص التشريع الإسلامي في السياسة والحكم (بيروت:المكتب العلمية 1996ء)
30. فتلاوي ،سهيل حسن،الحصانة القضائية للمبعوث الدبلوماسي، دراسة قانونية، (قاهره: المكتب المصري لتوزيع المطبوعات 1997)
31. كاسانى،ابوبكربن مسعود،بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع(بيروت:دارالكتب العلمية ،1985ء)
32. ابن كثير، اسمعيل بن عمر، البدايه والنهايه(قاهره:مطبعة السعاده،1998ء)
33. ابن قيم الجوزيہ،محمد بن ابوبكر،الطريق الحكميہ (بيروت:دارلبنان،1997ء)
34. ماوردى، على بن محمد،ادب الدنيا والدين (قاهره:دارالمنهاج، 2001ء)
35. ماوردى، على بن محمد،الاحكام السلطانية(قاهره: دارالحديث،2010ء)
36. مجلة الأحكام العدليہ ماده 1785
37. مجيد خدورى، مفهوم العدل فى الاسلام (دمشق: دارالحصاد، 2007ء)

38. محمد سلمان، القانون الدولی العام (،قاهره:الهيئة المصرية للكتاب،2019ء)
39. محمد عبدالجواد محمد،التشريعی فی المملكة العربية السعودية ،الطبعة الاولی،ص14
40. محمدی،حسن محمد،الحصانہ الجنائیہ (عمان:دارالثقافہ،2001ء)
41. منذر الفضل،تاريخ القانون (بيروت: دارانماء،1998ء)
42. موسوعة القانونية العراقية (قاهره:ايتراک للنشر،2001ء)،
43. ناصر الجوفان،ضمانات عدالة القضاء في الفقه والنظام (بيروت:دارالشروق، 2001ء)
44. هاني عمر،سيد،الديمقراطية الاسلاميه (قاهره:المكتب الفنی، 2017ء)،
45. هاني رضا،العلاقات الدبلوماسية(قاهره:دارالنهضہ،2014ء)
46. ابن هشام،عبدالرحمان بن عبدالله السهيلی(بيروت:دارالصحابہ للتراث، 2007ء)
47. وكيع،ابوبكرمحمد بن خلف، اخبار القضاء(قاهره :مكتبہ التجاريہ 1947)
48. ولد يوسف مولود،المحكمةالجنائيةالدولية(الجزائر:دارالأمل،للطباعةوالنشر والتوزيع2014ء)
49. يوسف حسن يوسف،المسؤولية الجنائية الدولية المؤسسات الدوليةوكيفية التقاضي،الدولي(قاهره:المركز القومي للإصدارات القانونية،2005)

کتب لغات:

1. إبراهيم انيس،المعجم الوسيط (استنبول:مكتبةالإسلامية ،2002ء)
2. اصفهانی،حسين بن محمد،معجم مفردات الفاظ القرآن،(کراچی:مکتبہمیر محمد2006ء)
3. افريقی، محمدبن مكرم ابن منظور، لسان العرب(ایران:مکتبہشرادب،2001ء)

اردو کتب:

1. سندیلوی، محمد اسحاق، اسلام کا سیاسی نظام (دہلی: مسلم بکس،2010ء)
2. محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی: مکتبہ معارف،2002ء)
3. مودودی، ابولاعلی، سید، الجہاد فی الاسلام (لاہور: ادارہ ترجمان القرآن،1996ء)
4. نعیم صدیقی، محسن انسانیت (لاہور: عکس پبلی کیشنز،2009ء)
5. نعمانہ، کرن عمران، دی فیڈرل کینٹ آف پاکستان،(کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2016ء)

انگلش کتب:

1. Charles Smith, 20th Century Encyclopaedia,A library of universal knowledge(London, Oxford Press,2001)
2. Ghulam Murtaza Azad, “Qualifications of a Qadi”, Islamic Studies (1984)
3. Hamid Khan,A History of judiciary inPakistan(Karachi: Oxford University Press, 2016)
4. Imran Ahsan Khan Nyazee, Jurisprudence(Rawalpindi: Federal Law House, 2015)
5. Jitsi,H.F, Prince, Pen and Sword. Eurasian Perspective (London, Oxford Press, 2010)
6. M. H. Kamali, “Appellate Review And Judicial Independence In Islamic Law”, Islamic Studies (1990)
7. Nasim Hasan Shah, Memoirs and Reflections (Islamabad: Alhamra, 2002)
8. Syed Shabbar Raza, Rizvi, Appointment of Judges in the Superior Judiciary of Pakistan under Article 175-A (Lahore: KLR, 2016)

ویب سائٹس:

1. http://43.245.130.98:8056/caselaw/view file/MTU0NzE2Y2Ztcy1kYzgz
2. https://onlinelibrary.wiley.com/doi/pdf/10.1111/j.1468-2230.1958.tb00491.x
3. https://onlinelibrary.wiley.com/doi/pdf/10.1111/j.1468-2230.1958.tb00491.x
4. https://www.jstor.org/stable/4506559
5. https://www.britannica.com/topic/sacred-kingship/Functions-of-the-sacred-king-the-king-as-the-source-of-cosmic-power-order-and-control
6. https://en.wikipedia.org/wiki/Christian_views_on_the_Old_Covenant
7. https://www.outlaw.com/page-8310.
8. http://www.supremeCourt .gov.pk/web/page.asp?id=435.
9. http://www.dawn.com/news/1289880
10. http://www.usip.org/sites/default/files/Judicial-Appointments-EN.pdf,

مقالہ جات:

1. John Murphy,"Rethinking tortious immunity for judicial acts"Legal Studies33, no. 3 (2012)
2. Judicial Independence, Ohio State Law Journal, Volume 64, Issue 1 (2003)
3. Muhammad Ashraf Qureshi v Competent Authority for (Judicial Officers) of AJ&K Judicial
4. Muhammad Munir, Precedent in Islamic Law with Special Reference to the Federal Shariat Court and the Legal System in Pakistan(2008)
5. The Pakistan painal code 1860
6. Quoted by good hartin ,New outlineof modern knowledge,
7. Saad Rasool,A Transparent Judicial Elevation Process, The Nation, 4th September, 2016, Opinion.
8. Service Department/ High Court of Azad Jammu & Kashmir, Muzaffarabad and 3 others, 2012 PLC (C.S)
9. Shirley S. Abrahamson, Keynote Address: Thorny Issues and Slippery Slopes: Perspectives on